Registered No. L. 4186

محرم ۱۳۶۶

ماهنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"
دارالاسلام - جمال پور - پٹھانکوٹ

قیمت فی پرچہ

قیمت سالانہ پانچ روپے

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے اُن مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جنکے متعلق آجکل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسُول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت، قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔ حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔ قیمت بجلد ۳ روپے، علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہو گئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک

ترجمان القرآن

فہرست مضامین

جلد ۳۶ | رمضان ۱۳۷۰ھ ــــ مطابق ــــ جولائی ۱۹۵۱ء | عدد ۳

سید ابوالخیر مودودی نے مرکنٹائل پریس چیمبر لین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ہمارے لائحۂ عمل کا دوسرا بنیادی مقصد، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، یہ ہے کہ عوام الناس کی ذہنی اور اخلاقی اصلاح کی جائے تاکہ ہمارا معاشرہ جاہلیت کی بنیادوں سے ہٹ کر اسلام کی صالح بنیادوں پر قائم ہو اور اس قابل بن جائے کہ اس میں برائیاں دبیں اور بھلائیاں نشوونما پا سکیں۔ اس مقصد کے لئے جس پروگرام پر ہم کام کر رہے ہیں اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک شخص موجودہ مسلم معاشرے کے امراض کی اُس تشخیص کو اچھی طرح سمجھ لے جو ہم نے کی ہے کیونکہ تشخیص کو سمجھے بغیر علاج کو سمجھنا مشکل ہے۔ نہ ہمارے اپنے کارکن تجویزِ علاج پر صحیح طریقہ سے عمل کر سکتے ہیں اگر وہ تشخیصِ مرض کو نہ سمجھیں، اور نہ ہمارے کام کو دیکھنے والے صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں اگر وہ یہ نہ جانیں کہ ہمارے نزدیک وہ مرض کیا ہے جس کا علاج ہم کرنا چاہتے ہیں۔

ہماری نگاہ میں اس وقت ہمارا معاشرہ تین مختلف عناصر پر مشتمل ہے۔

ایک وہ عنصر جو یا تو ذہنی طور پر اسلام سے منحرف ہے، یا اخلاقی حیثیت سے اسکی اطاعت و پیروی پر راضی نہیں ہے، یا جس کے مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں اصلی اور حقیقی اسلام اور پورا اسلام نافذ نہ ہونے پائے۔ یہ عنصر بہت سے چھوٹے بڑے گروہوں میں بٹا ہوا ہے۔

ان میں کچھ مخلص ملاحدہ ہیں جو سوچ سمجھ کر غیر اسلامی نظریات پر ایمان لائے ہیں، غیر اسلامی قدروں کو دل سے اپنا چکے ہیں، اپنے الحاد کا صاف صاف اظہار کرتے ہیں اور اسلام کے نام سے فریب نہیں دیتے۔ اگرچہ اتنی فریب کاری ان میں بھی پائی جاتی ہے کہ انہوں نے اپنے نام تبدیل نہیں کیے اور مسلم سوسائٹی سے اپنا ظاہری تعلق نہیں توڑا، تاہم یہی کیا غنیمت ہے کہ وہ اسلام کے علمبردار نہیں بنتے، نہ اس کے مفسرین بن کر سامنے آتے ہیں۔

کچھ دوسرے لوگ مکار ملاحدہ ہیں جن کے دل اور دماغ تو مخلص ملاحدہ ہی کی طرح اسلام سے منحرف

ہو چکے ہیں، مگر وہ اس کے علمبردار اور اس کو قائم کرنے کے مدعی بن کر اٹھتے ہیں تاکہ مسلمانوں کی قیادت و سیادت پر وہی فائز ہوں اور اقتدار کی باگیں انہی کے ہاتھ میں رہیں۔

کچھ اور لوگ نیم الحاد اور نیم اسلام کے مقام پر ہیں۔ اسلام سے بالکل انکار تو نہیں کرتے مگر قرآن و سنت کا خالص اسلام ان کے لئے ناقابلِ قبول ہے۔ اس کے بجائے وہ اپنی مرضی کا ایک نیا اسلام تصنیف کر کے اسے حقیقی اسلام بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی قرآن سے کھیل رہا ہے، کوئی قرآن و حدیث دونوں کو تختۂ مشق بنا رہا ہے، کوئی ابوذر غفاریؓ کی آڑ لے رہا ہے، اور کسی کے ہاتھوں بیچارے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی شامت آ رہی ہے۔

کچھ اور لوگ ہیں جن کی اسلام سے بغاوت فکری و نظری بنیادوں پر نہیں بلکہ یا تو اخلاقی بنیادوں پر ہے یا معاشی بنیادوں پر۔ یہ ہمارے مترفین ہیں۔ ان کو یہ گوارا نہیں ہے کہ اسلام آکر ان کی خواہشاتِ نفس اور ان کی آزادیوں پر حدود و قیود عائد کرے، ان کی حرام خوریوں کا خاتمہ کر دے، اور ان کے معاشی ظلم کا استیصال کر کے ان کی آمد و خرچ پر پہرے بٹھائے۔ اس گروہ کے لوگوں کو اسلام کبھی یاد آتا ہے تو صرف اُس وقت جب اشتراکی نظریات کی چوٹ ان کے مفاد پر پڑتی نظر آتی ہے۔ اس وقت وہ اسلام کو اپنے گھرانے کے پرانے خادم کی حیثیت سے پکارتے ہیں کہ آ اور اس غاصب کو مار کر بھگا دے۔ مگر عین اس فریاد کے وقت بھی وہ اپنی زندگی کے کسی دوسرے معاملہ میں اس "خاندانی ملازم" کو بولنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس باب میں اگر وہ ذرا سی لب کشائی بھی کر بیٹھے تو بیچارہ فوراً ملازم سے "ملّا ازم" بن کر رہ جاتا ہے۔

ایک اور گروہ مذہبی سوداگروں کا ہے جن کا سارا کاروبار ہی اس پر منحصر ہے کہ عام مسلمان اپنے دین سے جاہل رہیں، مشرکانہ اوہام میں مبتلا رہیں، خلق اور خالق کے درمیان ان کو بطور ایک مستقل واسطے کے تسلیم کریں۔ اور اپنی بے قید دنیوی زندگی کی کامیابیوں کے لئے، نیز ساری بے قیدیوں کے باوجود نجات کی گارنٹی حاصل کرنے کے لئے ان کی روحانی تائید اچھی قیمت پر خریدتے رہیں۔

ان سے بہت مختلف کچھ دوسرے مذہبی سوداگر بھی موجود ہیں جن کے لئے سب سے بڑا مسئلہ اپنی گدیوں اور چھوٹی چھوٹی مذہبی ریاستوں کی حفاظت کا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے جن اسامیوں اور گاہکوں کو اگلوں

سے میراث میں پایا ہے یا خود اپنی محنت سے فراہم کیا ہے ان کو وہ ہر قیمت پر اپنے کاروبار سے وابستہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اقامت دین کی کسی ہمہ گیر تحریک کو ــــ خواہ وہ کیسی ہی صحیح بنیادوں پر اٹھی ہو اور کتنی ہی سلامت روی کے ساتھ چلائی جا رہی ہو، اور خواہ ان کا اپنا علم اور ضمیر اس کے برحق ہونے کی شہادت دے رہا ہو ــــ برداشت کرنا ان کے لئے مشکل ہوتا ہے، کیونکہ اسے دیکھتے ہی فوراً انہیں یہ اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں ان کے اپنے حلقے ٹوٹ کر اس بڑے دائرے میں جذب نہ ہو جائیں اور ان کی مرکزیت مجروح ہو کر نہ رہ جائے۔ ان میں سے اکثر "اہل دین" حضرات نے "اہل دنیا" سے طرح طرح کی مصالحتیں کر رکھی ہیں، دین و دنیا کی تقسیم اور دین کے محدود تصور کو بڑے بڑے نظر فریب مذہبی دلائل سے ثابت کر رکھا ہے، اور ان دلائل کو بڑی پاکیزہ اور محترم مذہبی شخصیتوں کے ذاتی عمل نے مضبوط کر رکھا ہے۔ ان کے ہاں اب تک جس تخیل کو مقبولیت حاصل رہی ہے وہ یہ ہے کہ ایک بہترین نظام زندگی وہ ہے جسے اہل دنیا اپنے حسب منشا جس طرح چاہیں اور جن قوانین و ضوابط پر چاہیں چلاتے رہیں، مگر مذہبی مراسم بڑی عقیدت مندیوں کے ساتھ ادا کریں، مذہبی شخصیتوں کے آگے خراج عقیدت پیش کرتے رہیں، مذہبی اداروں کی فیاضانہ سرپرستی کرتے رہیں، اور مذہب کے محدود دائرے میں اہل مذہب کی ریاست کا لحاظ رکھیں۔ اور اگر کہیں وہ ایک شیخ الاسلامی کا عہدہ قائم کر کے پرسنل لا کی حد تک قضا و افتاء کے اختیارات اور مذہبی اوقاف و مدارس کی نگرانی بھی ان کے حوالہ کر دیں تو بس یہ ایک آئیڈیل اسلامی ریاست ہے۔ ان حضرات کے لئے اب یہ ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ اگر دین کی وہ تعبیر و تفسیر صحیح ہے جس کی رو سے دین و دنیا کی تقسیم کا ہر نظریہ غلط، کفر و فسق کی سیادت و قیادت سے ہر مصالحت غلط، اور پورے نظام زندگی پر دین کا ہمہ گیر تسلط ناگزیر، تو اس کے بعد ان کے علم اور عمل کی کیا ساکھ باقی رہ جاتی ہے جو اب تک اس تعبیر و تفسیر کے خلاف رہی ہے۔

ان مختلف گروہوں کے درمیان آپس میں بڑے اختلافات ہیں، اور ہم ان میں سے کسی کے ساتھ بھی یہ بے انصافی نہیں کر سکتے کہ ان کے اختلافات کو بناوٹی قرار دیں۔ درحقیقت بڑے اخلاص کے

ساتھ یہ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی پر بھی یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ دین کے بارے میں اس کا نظریہ کسی دوسرے گروہ کے نظریہ سے متحد ہے۔ لیکن اس بات کو جاننے اور ماننے کے باوجود جس بنا پر ہم ان سب کو ملا کر ایک عنصر قرار دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ جب اقامت دین کی کوئی تحریک اٹھتی ہے تو یہ سارے گروہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک ہو جاتے ہیں۔ پچھلی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے اور آج کا تجربہ بھی یہی ظاہر کر رہا ہے۔ اس لئے تحریک اقامت دین کے نقطۂ نظر سے یہ سب ایک ہی عنصر قرار پاتے ہیں۔

تعداد کے لحاظ سے یہ عنصر بحیثیت مجموعی ہماری قوم کا ایک بہت ہی قلیل عنصر ہے، لیکن سیاسی طاقت اور معاشی وسائل، دونوں پر اس کا قبضہ ہے۔ عوام الناس کی بڑی تعداد اس کے پھندے میں پھنسی ہوئی ہے۔ اور جھوٹ کی اشاعت سے عوام کو فریب دینے کے بہت سے ہتھکنڈے اس کے پاس ہیں۔

ہمارا اس عنصر کے ساتھ دوگونہ معاملہ ہے۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے، وہ سب ہمارے انسانی اور قومی بھائی ہیں۔ ہم ان کا شخصی احترام کرتے ہیں خواہ وہ ہمیں گالیوں ہی سے کیوں نہ نوازیں۔ ان کے ساتھ ہمارا کوئی ذاتی جھگڑا نہیں ہے۔ بلکہ ہم دل سے ان کے خیر خواہ ہیں اور اپنی حد تک انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح ان کی اصلاحِ خیال ہو جائے اور اللہ تعالیٰ ان کا سینہ حق کے لئے کھول دے۔ لیکن جہاں تک ان کے ایک ایسے عنصر کا تعلق ہے جو تحریک اقامت دین کی راہ روکنے والا ہے، ہماری ان سے جنگ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس عنصر کے بہت کم افراد کو بے لاگ حق پرستی کی توفیق نصیب ہوا کرتی ہے، اور وہ بھی اپنے نفس کے ساتھ جہاد اکبر کیئے بغیر اس چیز کو اختیار نہیں کر سکتے۔ اس لئے نہ تو محض چند صالح بندے مل جانے کی امید پر اس عنصر کے ساتھ مداہنت برتی جا سکتی ہے، اور نہ کوئی ایسا شخص جو دین اللہ الخالص کے قیام کا خواہشمند ہو، اس کے ساتھ مصالحت پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ درحقیقت اقامتِ دین کی راہ کا روڑا یہی عنصر ہے۔ اس کو ہٹانا، عوام الناس کو اس کے دباؤ اور اثر سے نکالنا، اور اقتدار کی مسندوں سے اس کو بے دخل کرنا ایک ایسا ناگزیر تخریبی کام ہے جس کے بغیر کوئی تعمیری و اصلاحی کام بار آور ہی

نہیں سکتا۔

دوسرا عنصر اُن صالح لوگوں پر مشتمل ہے جو دین کو تھوڑا یا بہت جانتے ہیں، اور جس قدر بھی اسے جانتے ہیں اُس کو اخلاص کے ساتھ مانتے ہیں، اور ہر اُس چیز کی اطاعت و حمایت کے لئے تیار رہتے ہیں جو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی دلیل سے حق ثابت ہو جائے۔ یہ لوگ قوم کے ہر طبقے میں موجود ہیں۔ غریبوں میں بھی اور امیروں میں بھی۔ رعیت میں بھی اور حکام میں بھی۔ نئے تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی اور پرانے طرز کے علماء میں بھی۔ اگرچہ یہ بھی تعداد میں بہت کم ہیں، لیکن مایوس کن حد تک کم نہیں ہیں۔ بلکہ شاید ہم مبالغہ نہ کریں گے اگر یہ کہیں کہ اول الذکر عنصر سے اِس دوسرے عنصر کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قوم کی اصل طاقت یہی لوگ ہیں اور یہاں اصلاح کی جتنی امیدیں ہیں، اِنہی سے وابستہ ہیں۔ اپنی بداعمالیوں کے باوجود اب تک اِس قوم پر اللہ کی جو رحمتیں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں ان کی وجہ یہی ہے کہ اس گئی گذری حالت میں بھی یہ بقیۃ القوم اس کے اندر معتدبہ تعداد میں موجود ہیں اور ان کے ہاتھوں خیر و صلاح کے قیام کے امکانات ہیں۔

اس گروہ میں مختلف قسم کی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض اپنے ناقص مطالعہ کی وجہ سے دین کے محدود تصور میں مبتلا ہیں اور وسیع و ہمہ گیر تصور کو اخذ کرنے میں مشکل محسوس کرتے ہیں۔ بعض جزئیات و کلیات کے فرق کو نہیں سمجھتے اور غیر اہم چیزوں کو اتنا اہم قرار دے بیٹھتے ہیں کہ اصل اہمیت رکھنے والی چیزیں ان کی نگاہ میں کم وزن ہو گئی ہیں۔ بعض کا فہم دین تو صحیح ہے، مگر یا تو وہ اپنے فرض کو ابھی تک پوری طرح نہیں پہچانتے، یا ان کے اندر قوتِ عمل کی کمی ہے، یا اُن پر یاس کا غلبہ ہے، یا ان کو علم نہیں ہے کہ ان کے ملک میں اقامتِ دین کی کوئی سعی ہو رہی ہے، یا وہ سعی کرنے والوں کو ابھی تک شک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں، یا انہیں توقع ہے کہ محدود قسم کی اصلاحی تدبیروں سے کام چل جائیگا۔

ہماری تمام تر کوشش یہ ہے کہ اس عنصر کی یہ ساری کمزوریاں دور ہوں۔ یہ بیدار ہو، منظم ہو، حرکت میں آسکے، اور خواہ یہ ہمارے ساتھ ملے یا نہ ملے، بہر حال اقامتِ دین کی سعی میں ہم کو اس کا زیادہ سے

زیادہ تعاون حاصل ہو۔

تیسرا عنصر عوام پر مشتمل ہے۔ یہ ہماری قوم کا سواد اعظم ہے۔ ہماری کل آبادی کا ۹۰ فیصدی، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ یہ لوگ اسلام سے گہری عقیدت اور مخلصانہ محبت رکھتے ہیں۔ اس کے نام پر جان و مال پہلے بھی قربان کرتے رہے ہیں اور آج بھی اس پر آمادہ ہیں۔ اسلام کے سوا کوئی چیز ان کو اپیل نہیں کرتی، اور جس چیز کو یہ جان لیں کہ یہ اسلام کے خلاف ہے، اُسے چاہے مجبوراً برداشت کرلیں، دل سے کبھی گوارا نہیں کرتے۔ مگر ان غریبوں کو کئی روگ لگے ہوئے ہیں۔

سب سے بڑا اور بنیادی روگ یہ ہے کہ جس اسلام سے یہ عشق رکھتے ہیں اس کو جانتے نہیں ہیں۔ اس کی تفصیلات سے ہی نہیں، اس کے اصول و مبادی تک سے بے خبر ہیں۔ اسی لئے ہر ضالّ و مضلّ شخص اسلام کا لباس پہن کر ان کو بہکا سکتا ہے۔ ہر غلط عقیدہ اور غلط طریقہ اسلام کے نام سے ان کے اندر پھیلایا جا سکتا ہے۔

دوسرا بڑا روگ یہ ہے کہ ایک مدتِ دراز سے ان کی اخلاقی تربیت کا کوئی انتظام نہیں ہوا ہے۔ یہ خودرَو درختوں کی طرح اُگتے اور پرورش پاتے رہے ہیں۔ اسلامی اخلاق تو درکنار، بنیادی انسانی اخلاقیات تک ان میں پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ پچھلے ڈیڑھ دو سو برس کے دورِ غلامی میں اخلاقی حیثیت سے یہ مسلسل پستی کی جانب بڑھتے رہے ہیں۔

اس پر مزید یہ کہ ان کی اپنی قوم کے اہلِ دماغ اور با اثر طبقوں نے (جن کو ہم نے پہلے عنصر میں شمار کیا ہے) انہیں اور بہت سے نئے روگ لگا دیئے ہیں۔ یہ غریب تعلیم کے لئے جدید درسگاہوں میں جاتے ہیں تو وہاں زیادہ تر مخلص اور مکار ملاحدہ، یا نیم مسلم و نیم ملحد حضرات سے ان کو پالا پڑتا ہے۔ قدیم مدارس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اکثر مذہبی سوداگروں کے ہتّھے چڑھ جاتے ہیں۔ دینی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو خطیبوں اور واعظوں کی عظیم اکثریت انہیں گمراہ کرتی ہے۔ روحانی تربیت کے طالب ہوتے ہیں تو پیروں کی غالب اکثریت ان کے لئے رہزن ثابت ہوتی ہے۔ دنیوی معلومات کے سرچشموں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اُن اخبارات اور رسائل سے ان کو سابقہ پیش آتا ہے جن کی بہت بڑی

اکثریت ہماری قوم کے سب سے زیادہ رذیل طبقہ کے ہاتھ میں ہے۔ قومی اور ملکی معاملات کی سربراہ کاری کے لئے لیڈر ڈھونڈتے ہیں تو وہ زیادہ تر ملاحدہ اور نیم ملاحدہ اور مترفین کے گروہ سے نکلتے ہیں۔ اپنی معیشت کی تلاش میں رزق کے منبعوں کی طرف جاتے ہیں تو وہاں بیشتر ان لوگوں کو قابض پاتے ہیں جنہوں نے حرام وحلال کے امتیاز کو مستقل طور پر ختم کر رکھا ہے۔ غرض، ہماری قوم کے وہ طبقے جو دراصل ایک قوم کے دل اور دماغ ہوتے ہیں اور جن پر اُس کے بناؤ اور بگاڑ کا انحصار ہُوا کرتا ہے، اس وقت بدقسمتی سے ایک ایسا عنصر بنے ہوئے ہیں جو اسے بنانے کے بجائے بگاڑنے پر تُلا ہُوا ہے اور بناؤ کی ہر صحیح وکارگر تدبیر میں مزاحم ہے۔

موجودہ مسلم معاشرے کے عناصر ترکیبی کا یہ تجزیہ اور اس کے امراض کی یہ تشخیص اگر صحیح ہے، تو اب تجویز علاج پر غور کیجئے۔ ہمارے نزدیک علاج کی کوئی صورت بجز اس کے نہیں ہے کہ

عنصر دوم کو جہاں تک ممکن ہو قوم کے تمام طبقوں میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا جائے، ان کی ذہنی واخلاقی کمزوریوں کو دور کرنے کی پوری کوشش کی جائے، اور انہیں منظم کرکے اصلاح کے کام میں لگایا جائے۔

عنصر سوم میں اسلام کا صحیح علم اور جامع وہمہ گیر تصور زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلایا جائے اور ان کے اندر بنیادی انسانی اخلاقیات اور اسلامی اخلاقیات کو نشوونما دینے کی باقاعدہ سعی کی جائے۔

عنصر اول کے ضمیر کو پوری حکمت اور دلسوزی کے ساتھ اپیل کرنے کی کوشش تو برابر جاری رہے، مگر اصلاح کی بے جا توقعات اس سے وابستہ کرکے قوم کے سواد اعظم کو اس کے قبضہ وتسلط سے نکالنے کی کوشش میں ہرگز تساہل یا نرمی و رعایت سے کام نہ لیا جائے۔ رہا اس کے جھوٹ کا طوفان، اور اس کے فتنوں کا میگزین، اور اس کا سیاسی اور معاشی دباؤ، تو اس سے ڈر کر پیچھے ہٹنا تو ہمارے نزدیک فرار من الزحف سے کم تر درجے کا گناہ نہیں ہے۔

علاج کی اس تجویز کو سمجھ لینے کے بعد کسی شخص کو ہمارے عملی پروگرام کے سمجھنے میں زحمت پیش

(باقی صـ ۱۹۲ پر)

تفہیم القرآن

النحل

نام | رکوع ۹ کی آیت وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی محض علامت ہے نہ کہ عنوان اور موضوعِ بحث۔

زمانۂ نزول | متعدد اندرونی شہادتوں سے اس کے زمانۂ نزول پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً:۔

رکوع ۶ کی پہلی آیت وَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا فِی اللّٰہِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہجرتِ حبشہ واقع ہو چکی تھی۔

رکوع ۱۴ کی آیت مَنْ کَفَرَ بِاللّٰہِ مِنْ بَعْدِ اِیْمَانِہٖ الآیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ظلم و ستم پوری شدت کے ساتھ ہو رہا تھا اور یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ اگر کوئی شخص ناقابلِ برداشت اذیت سے مجبور ہو کر کلمۂ کفر کہہ بیٹھے تو اس کا کیا حکم ہے۔

رکوع ۱۵ کی آیات وَضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا قَرْیَۃً ...... اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ کا صاف اشارہ اس طرف ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد مکہ میں جو ہفت سالہ قحط رونما ہوا تھا وہ اس سورہ کے نزول کے وقت ختم ہو چکا تھا۔

اسی رکوع ۱۵ میں ایک آیت ایسی ہے جس کا حوالہ سورۂ انعام میں دیا گیا ہے، اور دوسری آیت ایسی ہے جس میں سورۂ انعام کی ایک آیت کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان دونوں سورتوں کا نزول قریب العہد ہے۔

ان شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس سورہ کا زمانۂ نزول بھی مکے کا آخری دور ہی ہے، اور اسی کی تائید سورہ کے عام اندازِ بیان سے بھی ہوتی ہے۔

موضوع اور مرکزی مضمون | شرک کا ابطال، توحید کا اثبات، دعوتِ پیغمبر کو نہ ماننے کے

بُرے نتائج پر تنبیہ و فہمائش، اور حق کی مخالفت و مزاحمت پر زجر و توبیخ۔

مباحث سورہ کا آغاز بغیر کسی تمہید کے یک لخت ایک تنبیہی جملے سے ہوتا ہے۔ کفار مکہ بار بار کہتے تھے کہ جب ہم تمہیں جھٹلا چکے ہیں اور کھلم کھلا تمہاری مخالفت کر رہے ہیں تو آخر وہ خدا کا عذاب آ کیوں نہیں جاتا جس کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو۔ اس بات کو بالکل تکیہ کلام کی طرح دہرانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبر نہ ہونے کا سب سے زیادہ صریح ثبوت سمجھتے تھے۔ اس پر فرمایا کہ بیوقوفو! خدا کا عذاب تو تمہارے سر پر تُلا کھڑا ہے، اب اس کے ٹوٹ پڑنے کے لئے جلدی نہ مچاؤ بلکہ جو ذرا سی مہلت باقی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد فوراً ہی تفہیم کی تقریر شروع ہو جاتی ہے اور حسب ذیل مضامین بار بار یکے بعد دیگرے سامنے آنے شروع ہوتے ہیں:

(۱) دل لگتے دلائل اور آفاق و انفس کے آثار کی کھلی کھلی شہادتوں سے سمجھایا جاتا ہے کہ شرک باطل ہے اور توحید ہی حق ہے۔

(۲) منکرین کے اعتراضات، شکوک، حجتوں اور حیلوں کا ایک ایک کر کے جواب دیا جاتا ہے۔

(۳) باطل پر اصرار اور حق کے مقابلہ میں استکبار کے بُرے نتائج سے ڈرایا جاتا ہے

(۴) اُن اخلاقی اور عملی تغیرات کو مجمل مگر دل نشین انداز سے بیان کیا جاتا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین انسانی زندگی میں لانا چاہتا ہے، اور اس سلسلہ میں مشرکین کو بتایا جاتا ہے کہ خدا کو رب ماننا جس کا انہیں دعویٰ تھا، محض خالی خولی مان لینا ہی نہیں ہے بلکہ اپنے کچھ تقاضے بھی رکھتا ہے جو عقائد، اخلاق اور عملی زندگی میں نمودار ہونے چاہئیں۔

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی ڈھارس بندھائی گئی ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کفار کی مزاحمتوں اور جفاکاریوں کے مقابلہ میں ان کا رویہ کیا ہونا چاہئے۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

آگیا اللہ کا فیصلہ[1]، اب اس کے لئے جلدی نہ مچاؤ۔ پاک ہے وہ اور بالا و برتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں[2]۔ وہ اس روح[3] کو اپنے جس بندے پر چاہتا ہے اپنے حکم سے

[1] یعنی بس وہ آیا ہی چاہتا ہے، اُس کے ظہور و نفاذ کا وقت قریب آلگا ہے۔ اِس بات کو صیغۂ ماضی میں یا تو اس کے انتہائی یقینی اور انتہائی قریب ہونے کا تصور دلانے کے لئے فرمایا گیا، یا پھر اس لئے کہ کفارِ قریش کی سرکشی و بدعملی کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور آخری فیصلہ کن قدم اٹھائے جانے کا وقت آ گیا تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ "یہ فیصلہ" کیا تھا اور کس شکل میں آیا؟ ہم یہ سمجھتے ہیں (واللہ اعلم بالصواب) کہ اس فیصلے سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے ہجرت ہے جس کا حکم تھوڑی مدت بعد ہی دیا گیا۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی جن لوگوں کے درمیان مبعوث ہوتا ہے ان کے جحود و انکار کی آخری سرحد پر پہنچ کر ہی اسے ہجرت کا حکم دیا جاتا ہے، اور یہ حکم ان کی قسمت کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد یا تو ان پر تباہ کن عذاب آجاتا ہے، یا پھر نبی اور اس کے متبعین کے ہاتھوں ان کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جاتی ہے۔ یہی بات تاریخ سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ ہجرت جب واقع ہوئی تو کفارِ مکہ سمجھے کہ یہ فیصلہ ان کے حق میں ہے، مگر آٹھ دس سال کے اندر ہی دنیا نے دیکھ لیا کہ نہ صرف مکے سے بلکہ پوری سرزمین عرب ہی سے کفر و شرک کی جڑیں اکھاڑ کر پھینک دی گئیں۔

[2] پہلے فقرے اور دوسرے فقرے کا باہمی ربط سمجھنے کے لئے پس منظر کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ کفار جو نبی اللہ علیہ وسلم کو بار بار چیلنج کر رہے تھے کہ اب کیوں نہیں آجاتا خدا کا وہ فیصلہ جس کے تم ہمیں ڈراوے دیا کرتے ہو، تو دراصل اس کے پیچھے اُن کا یہ خیال کارفرما تھا کہ ان کا مشرکانہ مذہب ہی برحق ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خواہ مخواہ اللہ کا نام لے کر ایک غلط مذہب پیش کر رہے ہیں جسے اللہ کی طرف سے کوئی منظوری حاصل نہیں ہے، ورنہ کیسے ممکن تھا کہ ہم اللہ سے پھرے ہوئے ہوتے اور یہ اُس کے بھیجے ہوئے ہوتے اور پھر بھی جو کچھ ہم ان کے ساتھ کر رہے ہیں اُس پر ہماری شامت نہ آجاتی۔ اِس لئے خدائی فیصلے کے قریب آلگنے کا اعلان کرتے ہی فوراً یہ ارشاد ہوا کہ اس کے نفاذ میں تاخیر کی وجہ ہرگز وہ نہیں ہے جو تم سمجھے بیٹھے ہو۔ اللہ اس سے بلند تر اور پاکیزہ تر ہے کہ کوئی اس کا شریک ہو۔

[3] یعنی روحِ نبوت کو جس سے بھر کر نبی کام اور کلام کرتا ہے۔ یہ وحی اور یہ پیغمبرانہ اسپرٹ چونکہ اخلاقی زندگی

(باقی صفحہ ۱۴۰)

ملائکہ کے ذریعے نازل فرما دیتا ہے[۱] (اس ہدایت کے ساتھ کہ لوگوں کو) "آگاہ کر دو، میرے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں ہے، لہٰذا تم مجھی سے ڈرو"[۲] اُس نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا ہے، وہ بہت بالا و برتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں[۳]۔

(بقیہ حاشیہ ۱۳۹) میں وہی مقام رکھتی ہے جو طبعی زندگی میں رُوح کا مقام ہے، اس لئے قرآن میں متعدد مقامات پر اس کے لئے رُوح کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

[۱] فیصلہ طلب کرنے کے لئے کفار جو چیلنج کر رہے تھے اس کے پس پشت چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار بھی موجود تھا، اس لئے شرک کی تردید کے ساتھ اور اس کے معاً بعد آپ کی نبوت کا اثبات فرمایا گیا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بناوٹی باتیں ہیں جو یہ شخص بنا رہا ہے۔ اللہ اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ نہیں، یہ ہماری بھیجی ہوئی رُوح ہے جس سے معلوم ہو کر یہ شخص نبوت کر رہا ہے۔

پھر یہ جو فرمایا کہ اپنے جس بندے پر اللہ چاہتا ہے یہ رُوح نازل کرتا ہے تو یہ کفار کے اُن اعتراضات کا جواب ہے جو وہ حضور پر کرتے تھے کہ اگر خدا کو نبی ہی بھیجنا تھا تو کیا بس ایک محمدؐ بن عبداللہ ہی اس کام کے لئے رہ گیا تھا، مکے اور طائف کے سارے بڑے بڑے سردار مر گئے تھے کہ ان میں سے کسی پر بھی نگاہ نہ پڑ سکی! اس طرح کے بیہودہ اعتراضات کا جواب اِس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا، اور یہی متعدد مقامات پر قرآن میں دیا گیا ہے کہ خدا اپنے کام کو خود جانتا ہے، تم سے مشورہ لینے کی حاجت نہیں ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو مناسب سمجھتا ہے آپ ہی اپنے کام کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔

[۲] اس فقرے سے یہ حقیقت واضح کی گئی کہ رُوحِ نبوت جہاں جس انسان پر بھی نازل ہوئی ہے یہی ایک دعوت لیکر آئی ہے کہ خدائی صرف ایک اللہ کی ہے اور بس وہی اکیلا اس کا مستحق ہے کہ اس سے تقویٰ کیا جائے، کوئی دوسرا اس لائق نہیں کہ اس کی ناراضی کا خوف، اس کی سزا کا ڈر، اور اس کی نافرمانی کے نتائج بد کا اندیشہ انسانی اخلاق کا لنگر اور انسانی فکر و عمل کے پورے نظام کا محور بن کر رہے۔

[۳] دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ شرک کی نفی اور توحید کا اثبات، جس کی دعوت خدا کے پیغمبر دیتے ہیں، اُسی کی شہادت زمین و آسمان کا پورا کارخانۂ تخلیق دے رہا ہے۔ یہ کارخانہ (باقی ۱۴۱ پر)

اس نے انسان کو ایک ذرا سی بوند سے پیدا کیا اور دیکھتے دیکھتے صریحاً وہ ایک جھگڑالو ہستی بن گیا۔ اس نے جانور پیدا کئے جن میں تمہارے لئے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی، اور طرح طرح کے دوسرے فائدے بھی۔ ان میں تمہارے لئے جمال ہے جبکہ صبح تم انہیں چرنے کے لئے بھیجتے ہو اور جبکہ شام انہیں واپس لاتے ہو۔ وہ تمہارے بوجھ ڈھو کر ایسے ایسے مقامات تک لے جاتے ہیں جہاں تم سخت جانفشانی کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے۔

(بقیہ حاشیہ نمبر ۱۴) کوئی خیالی گورکھ دھندا نہیں ہے بلکہ ایک سراسر مبنی بر حقیقت نظام ہے۔ اس میں تم جس طرف چاہو نگاہ اٹھا کر دیکھ لو، شرک کی گواہی کہیں سے نہ ملے گی، اللہ کے سوا دوسرے کی خدائی کہیں چلتی نظر نہ آئیگی، کسی چیز کی ساخت یہ شہادت نہ دیگی کہ اس کا وجود کسی اور کا بھی رہینِ منت ہے۔ پھر جب یہ ٹھوس حقیقت پر بنا ہوا نظام خالص توحید پر چل رہا ہے تو آخر تمہارے اس شرک کا سکہ کس جگہ رواں ہوسکتا ہے جبکہ اس کی تہ میں وہم و گمان کے سوا واقعیت کا شائبہ تک نہیں ہے؛

اس کے بعد آثار کائنات سے اور خود انسان کے اپنے وجود سے وہ شہادتیں پیش کی جاتی ہیں جو ایک طرف توحید پر اور دوسری طرف رسالت پر دلالت کرتی ہیں۔

لے اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں اور غالباً دونوں ہی مراد ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ نے نطفے کی حقیر سی بوند سے وہ انسان پیدا کیا جو بحث و استدلال کی قابلیت رکھتا ہے اور اپنے مدعا کے لئے حجتیں پیش کرسکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جس انسان کو خدا نے نطفہ جیسی حقیر چیز سے پیدا کیا ہے، اس کی خودی کا طغیان تو دیکھو کہ وہ خود خدا ہی کے مقابلہ میں جھگڑنے پر اتر آیا ہے۔ پہلے مطلب کے لحاظ سے یہ آیت اسی استدلال کی ایک کڑی ہے جو آگے مسلسل کئی آیتوں میں پیش کیا گیا ہے (جس کی تشریح ہم اس سلسلۂ بیان کے آخر میں کریں گے)۔ اور دوسرے مطلب کے لحاظ سے یہ آیت انسان کو متنبہ کرتی ہے کہ بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے سے پہلے ذرا اپنی ہستی کو دیکھ۔ کس شکل میں تو کہاں سے نکل کر کہاں پہنچا، کس جگہ تو نے ابتداءً پرورش پائی، پھر کس راستے سے تو برآمد ہوکر دنیا میں آیا، پھر کن مرحلوں سے گذرتا ہوا تو جوانی کی عمر کو پہنچا، اور اب اپنے آپ کو بھول کر تو کس کے منہ آرہا ہے۔

اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کئے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور وہ تمہاری زندگی کی رونق بنیں۔ وہ اور بہت سی چیزیں (تمہارے فائدے کے لئے) پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم تک نہیں ہے[1] اور اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ بتانا جبکہ راستے ٹیڑھے بھی موجود ہیں[2]، اگر وہ چاہتا تو تم سب کو

---

[1] یعنی بکثرت ایسی چیزیں ہیں جو انسان کی بھلائی کے لئے کام کر رہی ہیں اور انسان کو خبر تک نہیں ہے کہ کہاں کہاں کتنے خدام اس کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

[2] توحید اور رحمت و ربوبیت کے دلائل پیش کرتے ہوئے یہاں اشارۃً نبوت کی بھی ایک دلیل پیش کر دی گئی ہے۔ اس دلیل کا مختصر بیان یہ ہے کہ دنیا میں انسان کے لئے فکر و عمل کے بہت سے مختلف راستے ممکن ہیں اور عملاً موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سارے راستے بیک وقت حق (یعنی مطابق حقیقت) نہیں ہو سکتے۔ سچائی تو ایک ہی ہے اور صحیح نظریۂ حیات صرف وہی ہو سکتا ہے جو اس سچائی کے مطابق ہو۔ پھر عمل کے بیشمار ممکن راستوں میں سے صحیح راستہ بھی صرف وہی ہو سکتا ہے جو صحیح نظریۂ حیات پر مبنی ہو۔ اس صحیح نظریے اور صحیح راہِ عمل کا علم انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے، بلکہ اصل بنیادی ضرورت یہی ہے کیونکہ دوسری تمام چیزیں تو انسان کی صرف اُن ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں جو ایک اُونچے درجے کا جانور ہونے کی حیثیت سے اس کو لاحق ہوا کرتی ہیں۔ اور یہ ایک ضرورت ایسی ہے جو انسان ہونے کی حیثیت سے اس کو لاحق ہے۔ یہ اگر پوری نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کی ساری زندگی ہی ناکام ہو گئی۔ اب غور کرو کہ جس خدا نے تمہیں وجود میں لانے سے پہلے تمہارے لئے یہ کچھ سروسامان مہیا کر کے رکھا، اور جس نے وجود میں لانے کے بعد تمہاری حیوانی زندگی کی ایک ایک ضرورت کو پورا کرنے کا اتنی دقیقہ سنجی کے ساتھ اتنے بڑے پیمانے پر انتظام کیا، کیا اس سے تم یہ توقع رکھتے ہو کہ اس نے تمہاری انسانی زندگی کی اس سب سے بڑی اور اصلی ضرورت کو پورا کرنے کا بندوبست نہ کیا ہوگا؟ یہی بندوبست تو ہے جو نبوت کے ذریعہ سے کیا گیا ہے۔ اگر تم نبوت کو نہیں مانتے تو بتاؤ کہ تمہارے خیال میں خدا نے انسان کی ہدایت کے لئے اور کونسا انتظام کیا ہے؟ اس کے جواب میں تم نہ یہ کہہ سکتے ہو کہ خدا نے ہمیں راستہ تلاش کرنے کے لئے عقل و فکر دے رکھی ہے، کیونکہ انسانی عقل و فکر پہلے ہی بے شمار مختلف راستے ایجاد کر بیٹھی ہے جو راہ راست (باقی ص ۱۴۵ پر)

ع۲ ہدایت دے دیتا ۔[1]

وہی ہے جس نے آسمان سے تمہارے لئے پانی برسایا جس سے تم خود بھی سیراب ہوتے ہو اور تمہارے جانوروں کے لئے بھی چارہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس پانی کے ذریعہ سے کھیتیاں اُگاتا ہے۔ اور زیتون، اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے۔ اِس میں ایک بڑی نشانی ہے اُن لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ ۱۲) کی صحیح دریافت میں اس کی ناکامی کا کھلا ثبوت ہے۔ اور نہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ خدا نے ہماری رہنمائی کا کوئی انتظام نہیں کیا ہے، کیونکہ خدا کے ساتھ اس سے بڑھ کر بدگمانی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ حیوانی حیثیت سے تو انسان کی پرورش اور اس کے نشو و نما کا اتنا مفصل اور مکمل انتظام کرے مگر انسانی حیثیت سے اس کو یونہی تاریکیوں میں بھٹکنے اور ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دے۔

[1] یعنی اگرچہ یہ بھی ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی اس ذمّہ داری کو (جو نوعِ انسان کی رہنمائی کے لئے اس نے خود اپنے اوپر عائد کی ہے) اس طرح ادا کرتا کہ سارے انسانوں کو پیدائشی طور پر دوسری تمام بے اختیار مخلوقات کے مانند برسرِ ہدایت بنا دیتا۔ لیکن یہ اس کی مشیت کا تقاضا نہ تھا۔ اس کی مشیت ایک ایسی ذی اختیار مخلوق کو وجود میں لانے کی متقاضی تھی جو اپنی پسند اور اپنے انتخاب سے صحیح اور غلط، ہر طرح کے راستوں پر جانے کی آزادی رکھتی ہو۔ اسی آزادی کے استعمال کے لئے اس کو علم کے ذرائع دیئے گئے، عقل و فکر کی صلاحیتیں دی گئیں، خواہش اور ارادے کی طاقتیں بخشی گئیں، اپنے اندر اور باہر کی بے شمار چیزوں پر تصرف کے اختیارات عطا کئے گئے، اور باطن و ظاہر میں ہر طرف بے شمار ایسے اسباب رکھ دیئے گئے جو اس کے لئے ہدایت اور ضلالت، دونوں کے موجب بن سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ بے معنی ہو جاتا اگر وہ پیدائشی طور پر راست رَو بنا دیا جاتا۔ اور ترقی کے اُن بلند ترین مدارج تک بھی انسان کا پہنچنا ممکن نہ رہتا جو صرف آزادی کے صحیح استعمال ہی کے نتیجے میں اس کو مل سکتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لئے جبری ہدایت کا طریقہ چھوڑ کر رسالت کا طریقہ اختیار فرمایا تاکہ انسان کی آزادی بھی برقرار رہے، اور اس کے امتحان کا منشا بھی پورا ہو، اور راہِ راست بھی معقول ترین طریقہ سے اس کے سامنے پیش کر دی جائے۔

اُس نے تمہاری بھلائی کے لئے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے اور سب تارے بھی اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔ اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ اور یہ جو بہت سی رنگ برنگ کی چیزیں اس نے تمہارے لئے زمین میں پیدا کر رکھی ہیں ان میں بھی ضرور نشانی ہے اُن لوگوں کے لئے جو سبق حاصل کرنے والے ہیں۔

وہی ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس سے تر و تازہ گوشت لے کر کھاؤ اور اس سے زینت کی وہ چیزیں نکالو جنہیں تم پہنا کرتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ کشتی سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی چلتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو[1] اور اس کے شکر گذار بنو۔

اس نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تاکہ زمین تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے[2]۔ اس نے دریا جاری کئے اور قدرتی راستے بنائے[3] تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ اس نے زمین میں راستہ بتانے والی علامتیں رکھ دیں[4]

---

[1] یعنی حلال طریقوں سے اپنا رزق حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سطح زمین پر پہاڑوں کے ابھار کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے زمین کی گردش اور اس کی رفتار میں انضباط پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر پہاڑوں کے اس فائدے کو نمایاں کرکے بتایا گیا ہے جس سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے تمام فائدے ضمنی ہیں اور اصل فائدہ یہی حرکتِ زمین کو اضطراب سے بچا کر منضبط (Regularise) کرنا ہے۔

[3] یعنی وہ راستے جو ندی، نالوں اور دریاؤں کے ساتھ ساتھ بنتے چلے جاتے ہیں۔ ان قدرتی راستوں کی اہمیت خصوصیت کے ساتھ پہاڑی علاقوں میں محسوس ہوتی ہے، اگرچہ میدانی علاقوں میں بھی وہ کچھ کم اہم نہیں ہیں۔

[4] یعنی خدا نے ساری زمین بالکل یکساں بنا کر نہیں رکھ دی بلکہ ہر خطے کو مختلف امتیازی علامات سے ممتاز کیا۔ اس کے بہت سے دوسرے فوائد کے ساتھ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے راستے اور اپنی منزل مقصود کو الگ پہچان لیتا ہے۔ اس نعمت کی قدر آدمی کو اسی وقت معلوم ہوتی ہے جبکہ اسے کبھی ایسے ریگستانی علاقوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہو جہاں اس طرح کے امتیازی نشانات تقریباً مفقود ہوتے ہیں اور آدمی ہر وقت بھٹک جانے کا خطرہ محسوس کرتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر (باقی صفحہ ۴۹ پر)

اور تاروں سے بھی لوگ ہدایت پاتے ہیں۔[له]

(حاشیہ صفحہ ۱۴۴) بحری سفر میں آدمی کو اس عظیم الشان نعمت کا احساس ہوتا ہے، کیونکہ وہاں نشاناتِ راہ بالکل ہی مفقود ہوتے ہیں۔ لیکن صحراؤں اور سمندروں میں بھی اللہ نے انسان کی رہنمائی کا ایک فطری انتظام کر رکھا ہے اور وہ ہیں تارے جنہیں دیکھ دیکھ کر انسان قدیم ترین زمانے سے آج تک اپنا راستہ معلوم کر رہا ہے۔

یہاں پھر توحید اور رحمت وربوبیت کی دلیلوں کے درمیان ایک لطیف اشارہ دلیلِ رسالت کی طرف کر دیا گیا ہے۔ اس مقام کو پڑھتے ہوئے ذہن خود بخود اس مضمون کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ جس خدا نے تمہاری مادی زندگی میں تمہاری رہنمائی کے لئے یہ کچھ انتظامات کئے ہیں کیا وہ تمہاری اخلاقی زندگی سے اتنا بے پروا ہو سکتا ہے کہ یہاں تمہاری ہدایت کا کچھ بھی انتظام نہ کرے؟ ظاہر ہے کہ مادی زندگی میں بھٹک جانے کا بڑے سے بڑا نقصان بھی اخلاقی زندگی میں بھٹکنے کے نقصان سے بدرجہا کم ہے۔ پھر جس ربِّ رحیم کو ہماری مادی فلاح کی اتنی فکر ہے کہ پہاڑوں میں ہمارے لئے راستے بناتا ہے، میدانوں میں نشاناتِ راہ کھڑے کرتا ہے، صحراؤں اور سمندروں میں ہم کو راستہ دکھانے کے لئے آسمانوں پر قندیلیں روشن کرتا ہے، اس سے یہ بدگمانی کیسے کی جا سکتی ہے کہ اس نے ہماری مادی فلاح کے لئے کوئی راستہ نہ بنایا ہوگا، اس راستہ کو نمایاں کرنے کے لئے کوئی نشان نہ کھڑا کیا ہوگا، اور اُسے صاف صاف دکھانے کے لئے کوئی سراجِ منیر روشن نہ کیا ہوگا؟

له یہاں تک آفاق اور انفس کی بہت سی نشانیاں جو پے در پے بیان کی گئی ہیں ان سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ انسان اپنے وجود سے لیکر زمین اور آسمان کے گوشے گوشے تک جدھر چاہے نظر دوڑا کر دیکھ لے، ہر چیز پیغمبر کے بیان کی تصدیق کر رہی ہے اور کہیں سے بھی شرک کی (اور ساتھ ساتھ دہریت کی بھی) تائید میں کوئی شہادت فراہم نہیں ہوتی۔ یہ ایک حقیر بوند سے بولتا چالتا اور حجت و استدلال کرتا انسان بنا کھڑا کرنا۔ یہ اس کی ضرورت کے عین مناسب بہت سے جانور پیدا کرنا جن کے بال اور کھال، خون اور دودھ، گوشت اور پیٹھ، ہر چیز میں انسانی فطرت کے بہت سے مطالبات کا حتیٰ کہ اس کے ذوقِ جمال کی مانگ تک کا جواب موجود ہے۔ یہ آسمان سے بارش کا انتظام اور یہ زمین میں طرح طرح کے پھلوں اور غلوں اور چاروں کی روئیدگی کا انتظام جس کے سارے بے شمار شعبے آپس میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کھاتے

(باقی ص ۱۴۶ پر)

پھر کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اور وہ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے، دونوں یکساں ہیں؟[1] کیا تم اتنا بھی

(بقیہ حاشیہ ص ۱۴۵) چلے جاتے ہیں اور پھر انسان کی بھی فطری ضرورتوں کے عین مطابق ہیں۔ یہ رات اور دن کی باقاعدہ آمد و رفت، اور یہ چاند اور سورج اور تاروں کی انتہائی منظم حرکات جن کا زمین کی پیداوار اور انسان کی مصلحتوں سے اتنا گہرا ربط ہے۔ یہ زمین میں سمندروں کا وجود اور یہ ان کے اندر انسان کی بہت سی طبعی اور جمالی طلبوں کا جواب۔ یہ پانی کا چند مخصوص قوانین سے جکڑا ہوا ہونا اور پھر اس کے یہ فائدے کہ انسان سمندر جیسی ہولناک چیز کا سینہ چیرتا ہوا اس میں اپنے جہاز چلاتا ہے اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک سفر اور تجارت کرتا پھرتا ہے۔ یہ دھرتی کے سینے پر پہاڑوں کے ابھار اور یہ انسان کی ہستی کے لئے ان کے فائدے۔ یہ سطح زمین کی ساخت سے لیکر آسمان کی بلند فضاؤں تک بے شمار علامتوں اور امتیازی نشانوں کا پھیلاؤ اور پھر اس طرح ان کا انسان کے لئے مفید ہونا۔ یہ ساری چیزیں صاف شہادت دے رہی ہیں کہ ایک ہی ہستی نے یہ منصوبہ سوچا ہے، اسی نے اپنے منصوبے کے مطابق ان سب کو ڈیزائن کیا ہے، اسی نے اس ڈیزائن پر ان کو پیدا کیا ہے، وہی ہر آن اس میں نت نئی چیزیں بنا بنا کر اس طرح لا رہا ہے کہ مجموعی اسکیم اور اس کے نظم میں ذرا فرق نہیں آتا، اور وہی زمین سے لیکر آسمانوں تک اس عظیم الشان کارخانے کو چلا رہا ہے۔ ایک بیوقوف یا ایک ہٹ دھرم کے سوا اور کون یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک اتفاقی حادثہ ہے، یا یہ کہ اس کمال درجہ منظم، مربوط اور متناسب کائنات کے مختلف کام یا مختلف اجزا مختلف خداؤں کے آفریدہ اور مختلف خداؤں کے زیر انتظام ہیں۔

[1] یعنی اگر تم یہ مانتے ہو (جیسا کہ فی الواقع کفار مکہ بھی مانتے تھے اور دنیا کے دوسرے مشرکین بھی مانتے ہیں) کہ خالق اللہ ہی ہے اور اس کائنات کے اندر تمہارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں سے کسی کا کچھ بھی پیدا کیا ہوا نہیں ہے تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خالق کے خلق کیے ہوئے نظام میں ان غیر خالق ہستیوں کی حیثیت اس کے برابر یا کسی طرح بھی اس کے مانند ہو؟ کیونکر ممکن ہے کہ اپنی خلق کی ہوئی کائنات میں جو اختیارات خالق کے ہیں وہی ان غیر خالقوں کے بھی ہوں، اور اپنی مخلوق پر جو حقوق خالق کو حاصل ہیں وہی حقوق غیر خالقوں کو بھی حاصل ہوں؟ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ خالق اور غیر خالق کی صفات ایک جیسی ہونگی، یا وہ ایک جنس کے افراد ہونگے، حتی کہ ان کے درمیان باپ اور اولاد کا رشتہ ہوگا؟

نہیں سمجھتے ؟ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو گن نہیں سکتے، حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی درگزر کرنے والا اور رحیم ہے[1]، حالانکہ وہ تمہارے کھلے سے بھی واقف ہے اور چھپے سے بھی۔[2]

اور وہ دوسری ہستیاں جنہیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کی بھی خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں، مُردہ ہیں نہ کہ زندہ۔ اور ان کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ انہیں کب (دوبارہ زندہ کر کے) اٹھایا

---

[1] پہلے اور دوسرے فقرے کے درمیان ایک پوری داستان اَن کہی چھوڑ دی ہے، اس لئے کہ وہ اس قدر عیاں ہے کہ اس کے بیان کی حاجت نہیں۔ اس کی طرف محض یہ لطیف اشارہ ہی کافی ہے کہ اللہ کے بے پایاں احسانات کا ذکر کرنے کے معاً بعد اس کے غفور و رحیم ہونے کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ اسی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جس انسان کا بال بال اللہ کے احسانات میں بندھا ہوا ہے وہ اپنے محسن کی نعمتوں کا جواب کیسی کیسی نمک حرامیوں، بے وفائیوں، غداریوں اور سرکشیوں سے دے رہا ہے، اور پھر اس کا محسن کیسا رحیم اور حلیم ہے کہ ان ساری حرکتوں کے باوجود وہ سالہا سال ایک نمک حرام شخص کو اور صدہا برس ایک باغی قوم کو اپنی نعمتوں سے نوازتا چلا جاتا ہے۔ یہاں وہ بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو علانیہ خالق کی ہستی ہی کے منکر ہیں اور پھر بھی نعمتوں سے مالا مال ہوئے جا رہے ہیں۔ وہ بھی پائے جاتے ہیں جو خالق کی ذات، صفات، اختیارات، حقوق، سب میں غیر خالق ہستیوں کو اس کا شریک ٹھیرا رہے ہیں اور منعم کی نعمتوں کا شکریہ غیر منعموں کو ادا کر رہے ہیں، پھر بھی نعمت دینے والا ہاتھ نعمت دینے سے نہیں رکتا۔ وہ بھی ہیں جو خالق کو خالق اور منعم ماننے کے باوجود اس کے مقابلے میں سرکشی و نافرمانی ہی کو اپنا شیوہ اور اس کی اطاعت سے آزادی ہی کو اپنا مسلک بنائے رکھتے ہیں، پھر بھی مدت العمر اس کے بے حد حساب احسانات کا سلسلہ ان پر جاری رہتا ہے۔

[2] یعنی کوئی احمق یہ نہ سمجھے کہ انکارِ خدا اور شرک اور معصیت کے باوجود نعمتوں کا سلسلہ بند نہ ہونا کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ کو لوگوں کے کرتوتوں کی خبر نہیں ہے۔ یہ کوئی اندھی بانٹ اور غلط بخشی نہیں ہے جو بے خبری کی وجہ سے ہو رہی ہو۔ یہ تو وہ حلم اور درگزر ہے جو مجرموں کے پوشیدہ اسرار بلکہ دل کی چھپی ہوئی نیتوں تک سے واقف ہونے کے باوجود کیا جا رہا ہے، اور یہ وہ فیاضی و عالی ظرفی ہے جو صرف ربّ العالمین ہی کو زیب دیتی ہے۔

جائے گا؟[1]

تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے۔ مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے اُن کے دلوں میں انکار بس کر رہ گیا ہے اور وہ گھمنڈ میں پڑ گئے ہیں[2]۔ اللہ یقیناً ان کے سب کرتوت جانتا ہے، چھپے ہوئے بھی اور

---

[1] یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں خاص طور پر جن بناوٹی معبودوں کی تردید کی جارہی ہے وہ فرشتے، یا جن، یا شیاطین، یا لکڑی پتھر کی مورتیاں نہیں ہیں، بلکہ اصحاب قبور ہیں۔ اس لئے کہ فرشتے اور شیاطین تو زندہ ہیں، ان پر اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءٍ کے الفاظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا، اور لکڑی پتھر کی مورتیوں کے معاملہ میں بعث بعد الموت کا کوئی سوال نہیں ہے اس لئے مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ کے الفاظ انہیں بھی خارج از بحث کر دیتے ہیں۔ اب لامحالہ اس آیت میں اَلَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے مراد وہ انبیاء، اولیاء، شہداء، صالحین اور دوسرے غیر معمولی انسان ہی ہیں جن کو غالی معتقدین داتا، مشکل کشا، فریاد رس، غریب نواز، گنج بخش، اور نہ معلوم کیا کیا قرار دے کر اپنی حاجت روائی کے لئے پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہے کہ عرب میں اس نوعیت کے معبود نہیں پائے جاتے تھے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ جاہلیتِ عرب کی تاریخ سے اس کی ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ کون پڑھا لکھا نہیں جانتا ہے کہ عرب کے متعدد قبائل، ربیعہ، غسان، کلب، تغلب، قضاعہ، کنانہ، حرث، کعب، کندہ وغیرہ میں کثرت سے عیسائی اور یہودی پائے جاتے تھے، اور یہ دونوں مذاہب بُری طرح انبیاء، اولیاء اور شہداء کی پرستش سے آلودہ تھے۔ پھر مشرکین عرب کے اکثر نہیں تو بہت سے معبود وہ گزرے ہوئے انسان ہی تھے جنہیں بعد کی نسلوں نے خدا بنا لیا تھا۔ بخاری میں ابن عباس کی روایت ہے کہ وِدّ، سواع، یغوث، یعوق، نسر، یہ سب صالحین کے نام ہیں جنہیں بعد کے لوگ بُت بنا بیٹھے۔ حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ اساف اور نائلہ دونوں انسان تھے۔ اسی طرح کی روایات لات اور مناۃ اور عزّیٰ کے بارے میں بھی موجود ہیں۔ اور مشرکین کا یہ عقیدہ بھی روایات میں آیا ہے کہ لات اور عزّیٰ اللہ کے ایسے پیارے تھے کہ اللہ میاں جاڑا لات کے ہاں اور گرمی عزّیٰ کے ہاں بسر کرتے تھے، سُبْحٰنَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ۔

[2] یعنی آخرت کے انکار نے ان کو اس قدر غیر ذمہ دار بے فکر، اور دنیا کی زندگی میں مست بنا دیا ہے (باقی صفحہ آئندہ)

کھلے ہوئے بھی۔ وہ اُن لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو غرورِ نفس میں مبتلا ہوں۔

اور جب[1] کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ تمہارے ربّ نے یہ کیا چیز نازل کی ہے تو کہتے ہیں "اجی وہ تو اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں[2]"۔ یہ باتیں وہ اس لئے کرتے ہیں کہ قیامت کے روز اپنے بوجھ بھی پورے اٹھائیں، اور ساتھ ساتھ کچھ ان لوگوں کے بوجھ بھی سمیٹیں جنہیں یہ بربنائے جہالت گمراہ کر رہے ہیں۔ دیکھو! کیسی سخت ذمہ داری ہے جو یہ اپنے سر لے رہے ہیں ع ان سے پہلے بھی بہت سے لوگ (حق کو نیچا دکھانے کے لئے) ایسی ہی مکاریاں کر چکے ہیں، تو دیکھ لو کہ اللہ نے اُن کے مکر کی عمارت جڑ سے اکھاڑ پھینکی اور اس کی چھت اُوپر سے ان کے سر پر آ رہی اور ایسے رُخ سے اُن پر عذاب آیا جدھر سے اس کے آنے کا ان کو گمان تک نہ تھا۔ پھر قیامت کے روز اللہ انہیں ذلیل و خوار کرے گا۔ وہ اُن سے کہے گا "بتاؤ اب کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے لئے تم ع۳

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۸) کہ اب انہیں کسی حقیقت کا انکار کر دینے میں باک نہیں رہا، کسی صداقت کی ان کے دل میں قدر باقی نہیں رہی، کسی اخلاقی بندش کو اپنے نفس پر برداشت کرنے کے لئے وہ تیار نہیں رہے، اور انہیں یہ تحقیق کرنے کی پروا ہی نہیں رہی کہ جس طریقہ پر وہ چل رہے ہیں وہ حق ہے بھی یا نہیں۔

[1] یہاں سے تقریر کا رُخ دوسری طرف پھرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مقابلہ میں جو شرارتیں کفارِ مکہ کی طرف سے ہو رہی تھیں، جو حجتیں آپ کے خلاف پیش کی جا رہی تھیں، جو حیلے اور بہانے ایمان نہ لانے کے لئے گھڑے جا رہے تھے، جو اعتراضات آپ پر وارد کیے جا رہے تھے، ان کو ایک ایک کر کے لیا جاتا ہے اور ان پر فہمائش، زجر اور نصیحت کی جاتی ہے۔

[2] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا چرچا جب اطراف و اکناف میں پھیلا تو مکّہ کے لوگ جہاں کہیں جاتے تھے ان سے پوچھا جاتا تھا کہ تمہارے ہاں جو صاحب نبی بن کر اٹھے ہیں وہ کیا تعلیم دیتے ہیں؟ قرآن کس قسم کی کتاب ہے؟ اس کے مضامین کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے سوالات کا جواب کفارِ مکہ ہمیشہ ایسے الفاظ میں دیتے تھے جن سے سائل کے دل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی لائی ہوئی کتاب کے متعلق کوئی نہ کوئی شک بیٹھ جائے، یا کم از کم اس سے دلچسپی باقی نہ رہے۔

(اہلِ حق سے) جھگڑے کیا کرتے تھے؟" [۱] — جن لوگوں کو دنیا میں علم حاصل تھا وہ کہیں گے "آج رسوائی اور بدبختی ہے کافروں کے لئے"۔ ہاں [۲] انہی کافروں کے لئے جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہوئے جب ملائکہ کے ہاتھوں گرفتار ہوتے ہیں [۳] تو (سرکشی چھوڑ کر) فوراً ڈگیں ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں "ہم تو کوئی قصور نہیں کر رہے تھے"۔ ملائکہ جواب دیتے ہیں "کر کیسے نہیں رہے تھے، اللہ تمہارے کرتوتوں سے خوب واقف ہے، اب جاؤ، جہنم کے دروازوں میں گھس جاؤ، وہیں تم کو ہمیشہ رہنا ہے" [۴]۔ پس حقیقت یہ ہے کہ بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے متکبروں کے لئے۔

---

[۱] یہاں دونوں فقروں کے درمیان ایک لطیف خلا ہے جسے سامع کا ذہن تھوڑے غور و فکر سے خود بھر سکتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ یہ سوال کریگا تو سارے میدانِ حشر میں ایک سناٹا چھا جائیگا۔ کفار و مشرکین کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔ ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ ہوگا، اس لئے وہ دم بخود رہ جائیں گے۔ تب اہلِ علم کے درمیان آپس میں یہ باتیں ہونگی۔

[۲] یہ فقرہ اہلِ علم کے قول پر اضافہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ خود بطور تشریح فرما رہا ہے۔ جن لوگوں نے اسے بھی اہلِ علم ہی کا قول سمجھا ہے انہیں بڑی تاویلوں سے بات بنانی پڑی ہے اور پھر بھی بات پوری نہیں بن سکی ہے۔

[۳] یعنی جب موت کے وقت ملائکہ ان کی روحیں ان کے جسم سے نکال کر اپنے قبضہ میں لے لیتے ہیں۔

[۴] یہ آیت اور اس کے بعد والی آیت جس میں قبضِ روح کے بعد متقیوں اور ملائکہ کی گفتگو کا ذکر ہے، قرآن مجید کی ان متعدد آیات میں سے ہے جو صریح طور پر عذاب و ثوابِ قبر کا ثبوت دیتی ہیں۔ حدیث میں "قبر" کا لفظ مجازاً عالمِ برزخ کے لئے استعمال ہوا ہے، اور اس سے مراد وہ عالم ہے جس میں موت کی آخری ہچکی سے لے کر بعث بعد الموت کے پہلے جھٹکے تک انسانی ارواح رہیں گی۔ منکرینِ حدیث کو اس پر اصرار ہے کہ یہ عالم بالکل عدمِ محض کا عالم ہے جس میں کوئی احساس اور شعور نہ ہوگا اور کسی قسم کا عذاب یا ثواب نہ ہوگا۔ لیکن یہاں دیکھیے کہ کفار کی روحیں جب قبض کی جاتی ہیں تو وہ موت کی سرحد کے پار کا حال بالکل اپنی توقعات کے خلاف پا کر سراسیمہ ہو جاتی ہیں اور فوراً سلام ٹھونک کر دیتی ہیں۔

دوسری طرف جب خدا ترس لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے جو تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ "بہترین چیز اتری ہے"۔ اس طرح کے نیکوکار

(بقیہ حاشیہ ص۱۵۰) ملائکہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتی ہیں کہ ہم کوئی بُرا کام نہیں کر رہے تھے۔ جواب میں ملائکہ ان کو ڈانٹ بتلاتے ہیں اور جہنم واصل ہونے کی پیشگی خبر دیتے ہیں۔ دوسری طرف اتقیا کی روحیں جب قبض کی جاتی ہیں تو ملائکہ ان کو سلام بجالاتے ہیں اور جنتی ہونے کی پیشگی مبارکباد دیتے ہیں۔ کیا برزخ کی زندگی، احساس، شعور، عذاب اور ثواب کا اس سے بھی زیادہ کھلا ہوا کوئی ثبوت درکار ہے؟ اسی سے ملتا جلتا مضمون سورۂ نساء رکوع ۱۴ کی پہلی آیت میں بھی ہے جہاں ہجرت نہ کرنے والے مسلمانوں سے قبضِ روح کے بعد ملائکہ کی گفتگو کا ذکر آیا ہے۔ اور ان سب سے زیادہ صاف الفاظ میں عذابِ برزخ کی تصریح سورۂ مومن رکوع ۵ میں کی گئی ہے جہاں اللہ تعالیٰ فرعون اور آلِ فرعون کے متعلق فرماتا ہے کہ "ایک سخت عذاب اُن کو گھیرے ہوئے ہے، یعنی صبح و شام وہ آگ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، پھر جب قیامت کی گھڑی آجائے گی تو حکم دیا جائے گا کہ آلِ فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کردو"۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور حدیث، دونوں سے موت اور قیامت کے درمیان کی حالت کا ایک ہی نقشہ معلوم ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ موت محض جسم و روح کی علیحدگی کا نام ہے نہ کہ بالکل عدم ہوجانے کا۔ جسم سے علیحدہ ہوجانے کے بعد روح معدوم نہیں ہوجاتی بلکہ اُس پوری شخصیت کے ساتھ زندہ رہتی ہے جو دنیا کی زندگی کے تجربات اور ذہنی و اخلاقی اکتسابات سے بنی تھی۔ اس حالت میں روح کے شعور، احساس، مشاہدات اور تجربات کی کیفیت خواب سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ ایک مجرم روح سے فرشتوں کی بازپرس اور پھر اس کا عذاب اور اذیت میں مبتلا ہونا اور دوزخ کے سامنے پیش کیا جانا، سب کچھ اُس کیفیت سے مشابہ ہوتا ہے جو ایک قتل کے مجرم پر پھانسی کی تاریخ سے ایک دن پہلے ایک ڈراؤنے خواب کی شکل میں گزرتی ہوگی۔ اسی طرح ایک پاکیزہ روح کا استقبال اور پھر اس کا جنت کی بشارت سننا اور اس کا جنت کی ہواؤں اور خوشبوؤں سے متمتع ہونا، یہ سب بھی اُس (باقی ص۱۵۲)

لوگوں کے لئے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی اُن کے حق میں بہتر ہے۔ بڑا اچھا گھر ہے متقیوں کا، دائمی قیام کی جنتیں، جن میں وہ داخل ہوں گے نیچے نہریں بہ رہی ہونگی، اور سب کچھ وہاں ان کی عین خواہش کے مطابق ہوگا۔[له] یہ جزا دیتا ہے اللہ متقیوں کو۔ اُن متقیوں کو جن کی روحیں پاکیزگی کی حالت میں جب ملائکہ قبض کرتے ہیں تو کہتے ہیں سلام ہو تم پر، جاؤ جنت

(بقیہ حاشیہ ص۱۵۱) ملازم کے خواب سے ملتا جلتا ہوگا جو حسنِ کارکردگی کے بعد سرکاری بلاوے پر ہیڈ کوارٹر میں حاضر ہُوا ہو اور وعدۂ ملاقات کی تاریخ سے ایک دن پہلے آئندہ انعامات کی اُمیدوں سے لبریز ایک سُہانا خواب دیکھ رہا ہو۔ یہ خواب یک لخت نفخِ صورِ دوم سے ٹوٹ جائے گا اور یکایک میدانِ حشر میں اپنے آپ کو جسم و روح کے ساتھ زندہ پاکر مجرمین حیرت سے کہیں گے کہ یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (ارے یہ کون ہمیں ہماری خوابگاہ سے اٹھا لایا؟) مگر اہلِ ایمان پورے اطمینان سے کہیں گے کہ ھٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (یہ وہی چیز ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں کا بیان سچا تھا)۔ مجرمین کا فوری احساس اُس وقت یہ ہوگا کہ وہ اپنی خوابگاہ میں (جہاں بسترِ موت پر انہوں نے دنیا میں جان دی تھی) شاید کوئی ایک گھنٹہ بھر سوئے ہونگے اور اب اچانک اس حادثہ سے آنکھ کھلنے کے بعد کہیں بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ مگر اہلِ ایمان پورے ثباتِ قلب کے ساتھ کہیں گے کہ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِیْ کِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰی یَوْمِ الْبَعْثِ فَھٰذَا یَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰکِنَّکُمْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (اللہ کے دفتر میں تو تم روزِ حشر تک ٹھیرے رہے ہو اور یہی روزِ حشر ہے مگر تم اس چیز کو نہ جانتے تھے)

له یہ ہے جنت کی اصل تعریف کہ وہاں انسان جو کچھ چاہے گا وہی اسے ملیگا اور کوئی چیز اس کی مرضی اور پسند کے خلاف واقع نہ ہوگی۔ دنیا میں کسی رئیس، کسی امیر کبیر، کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی یہ نعمت کبھی میسر نہیں آئی ہے، نہ یہاں اس کے حصول کا کوئی امکان ہے۔ مگر جنت کے ہر مکین کو راحت و مسرت کا یہ درجۂ کمال حاصل ہوگا کہ اس کی زندگی میں ہر وقت ہر طرف سب کچھ اس کی خواہش اور پسند کے عین مطابق ہوگا۔ اس کا ہر ارمان نکلے گا، اس کی ہر آرزو پوری ہوگی، اس کی ہر چاہت عمل میں آکر رہے گی۔

ہیں اپنے اعمال کے بدلے ۱؎

اے محمدؐ! اب جو یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں تو اس کے سوا اب اور کیا باقی رہ گیا ہے کہ ملائکہ ہی آ پہنچیں، یا تیرے رب کا فیصلہ صادر ہو جائے؟ اس طرح کی ڈھٹائی ان سے پہلے بہت سے لوگ کر چکے ہیں، پھر جو کچھ اُن کے ساتھ ہوا وہ اُن پر اللہ کا ظلم نہ تھا بلکہ ان کا اپنا ظلم تھا جو انہوں نے خود اپنے اوپر کیا۔ ان کے کرتوتوں کی خرابیاں آخر کار ان کی دامن گیر ہو گئیں اور وہی چیزیں ان پر مسلط ہو کر رہیں جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ع

یہ مشرکین کہتے ہیں "اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اُس کے سوا کسی اور کی عبادت کرتے اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھیراتے"۔ ایسے ہی بہانے ان سے پہلے کے لوگ بھی بناتے رہے ہیں۔۲؎ تو کیا رسولوں پر صاف صاف بات پہنچا دینے کے سوا اور بھی کوئی ذمہ داری ہے؟ ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیج دیا، اور اُس کے ذریعہ سے سب کو خبردار کر دیا کہ "اللہ کی

۱؎ یہ چند کلمے بطور نصیحت اور تنبیہہ کے فرمائے جا رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک سمجھانے کا تعلق ہے، ہم نے ایک ایک حقیقت پوری طرح کھول کر سمجھا دی ہے، دلائل سے ان کا ثبوت دے دیا ہے، کائنات کے پورے نظام سے اس کی شہادتیں پیش کر دی ہیں، اور شرک پر جمے رہنے کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اب یہ لوگ ایک صاف سیدھی بات کو ماننے میں کیوں تامل کر رہے ہیں؟ کیا اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ موت کا فرشتہ سامنے آ کھڑا ہو تو زندگی کے آخری لمحے میں مانیں گے؟ یا خدا کا عذاب سر پر آ جائے تو اس کی پہلی چوٹ کھا لینے کے بعد مانیں گے؟

۲؎ مشرکین کی اس حجت کو سورۂ انعام رکوع ۱۸ کی آخری آیتوں میں بھی نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے۔ وہ مقام اور اس کے حواشی اگر نگاہ میں رہیں تو سمجھنے میں زیادہ سہولت ہو گی۔

۳؎ یعنی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ آج تم لوگ اللہ کی مشیت کو اپنی گمراہی اور بداعمالی کے لئے حجت بنا رہے ہو۔ یہ تو بڑی پرانی دلیل ہے جسے ہمیشہ سے بگڑے ہوئے لوگ اپنے ضمیر کو دھوکا دینے اور ناصحوں کا منہ بند کرنے کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں۔

بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔ اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کسی پر ضلالت مسلط ہو گئی[۲]۔ پھر ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہو چکا ہے[۳]۔

حاشیہ نمبر ۱: یہ مشرکین کی حجت کا پہلا جواب ہے۔ اس کا پورا لطف اٹھانے کے لئے یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ ابھی چند سطریں پہلے مشرکین کے اس پروپیگنڈا کا ذکر گزر چکا ہے جو وہ قرآن کے خلاف یہ کہہ کہہ کر کیا کرتے تھے کہ "اجی، وہ تو پرانے قصوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں" گویا ان کو نبی پر اعتراض یہ تھا کہ یہ صاحب نئی بات کونسی لائے ہیں، وہی پرانی باتیں دہرا رہے ہیں جو طوفانِ نوح کے وقت سے لیکر آج تک ہزاروں مرتبہ کہی جا چکی ہیں۔ اس کے جواب میں یہاں ان کی ایک دلیل (جسے وہ بڑے زور کی دلیل سمجھتے ہوئے پیش کرتے تھے) کا ذکر کرنے کے بعد یہ لطیف اشارہ کیا گیا ہے کہ حضرات آپ ہی کون سے ماڈرن ہیں۔ یہ مایۂ ناز دلیل جو آپ لائے ہیں اس میں قطعی کوئی اپج موجود نہیں ہے، ایک دنیا نوسی بات ہے جو ہزاروں برس سے گمراہ لوگ کہتے چلے آ رہے ہیں، اور آپ نے بھی اسی کو دہرا دیا ہے۔

[۱] یعنی تم اپنے شرک اور اپنی خود مختارانہ تحلیل و تحریم کے حق میں ہماری مشیت کو کیسے سندِ جواز بنا سکتے ہو جبکہ ہم نے ہر امت میں اپنے رسول بھیجے اور ان کے ذریعہ سے لوگوں کو صاف صاف بتا دیا کہ تمہارا کام صرف ہماری بندگی کرنا ہے، طاغوت کی بندگی کے لئے تم پیدا نہیں کئے گئے ہو۔ اس طرح جبکہ ہم پہلے ہی معقول ذرائع سے تم کو بتا چکے ہیں کہ تمہاری ان گمراہیوں کو ہماری رضا حاصل نہیں ہے، تو اس کے بعد ہماری مشیت کی آڑ لیکر تمہارا اپنی گمراہیوں کو جائز ٹھیرانا صاف طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ تم چاہتے تھے کہ ہم سمجھانے والے رسول بھیجنے کے بجائے ایسے رسول بھیجتے جو ہاتھ پکڑ کر تم کو غلط راستوں سے کھینچ لیتے اور زبردستی تمہیں راست رو بناتے۔

[۲] یعنی ہر پیغمبر کی آمد کے بعد اس کی قوم دو حصوں میں تقسیم ہوئی۔ بعض نے اس کی بات مانی (اور یہ ماننا اللہ کی توفیق سے تھا)، اور بعض اپنی گمراہی پر جمے رہے۔

[۳] یعنی تجربے سے بڑھ کر تحقیق کے لئے قابلِ اعتماد کسوٹی اور کوئی نہیں ہے۔ اب تم خود دیکھ لو کہ تاریخِ انسانی کے پے درپے تجربات کیا ثابت کر رہے ہیں۔ عذابِ الٰہی فرعون و آلِ فرعون پر آیا یا موسیٰ اور بنی اسرائیل پر؟

—— اے محمدؐ تم چاہے اِن کی ہدایت کے لئے کتنے ہی حریص ہو، مگر اللہ جس کو بھٹکا دیتا ہے پھر اسے ہدایت نہیں دیا کرتا! اور نہ اس طرح کے لوگوں کی کوئی مدد کر سکتا ہے۔

یہ لوگ اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ " اللہ کسی مرنے والے کو پھر سے زندہ کر کے نہ اٹھائے گا" —— اٹھائیگا کیوں نہیں، یہ تو ایک وعدہ ہے جسے پورا کرنا اس نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ اور ایسا ہونا اس لئے ضروری ہے کہ اللہ ان کے سامنے اس حقیقت کو کھول دے جس کے بارے میں یہ اختلاف کر رہے ہیں، اور منکرین حق کو معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹے تھے[لہ]۔ رہا اس کا امکان تو ہمیں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لئے

(بقیہ حاشیہ ۲۶) بنی اسرائیل پر؟ صالح کے جھٹلانے والوں پر آیا یا ماننے والوں پر؟ ہود اور نوح اور دوسرے انبیاء کے منکرین پر آیا یا مومنین پر؟ کیا واقعی ان تاریخی تجربات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جن لوگوں کو ہماری مشیت نے شرک اور شریعت سازی کے ارتکاب کا موقع دیا تھا ان کو ہماری رضا حاصل تھی؟ اس کے برعکس یہ واقعات تو صریحاً یہ ثابت کر رہے ہیں کہ فہمائش اور نصیحت کے باوجود جو لوگ ان گمراہیوں پر اصرار کرتے ہیں انہیں ہماری مشیت ارتکاب جرائم کا خوب خوب موقع دیتی رہی ہے تاکہ ان کا سفینہ اچھی طرح بھر کر ڈوبے۔

لہ یہ حیات بعد الموت اور قیام حشر کی عقلی اور اخلاقی ضرورت ہے۔ دنیا میں جب سے انسان پیدا ہوا ہے حقیقت کے بارے میں بے شمار اختلافات رونما ہوئے ہیں۔ انہی اختلافات کی بنا پر نسلوں اور قوموں اور خاندانوں میں پھوٹ پڑی ہے۔ انہی کی بنا پر الگ نظریات رکھنے والوں نے اپنے الگ مذہب، الگ معاشرے، الگ تمدن بنائے یا اختیار کئے ہیں۔ ایک ایک نظریے کی حمایت اور وکالت میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے مختلف زمانوں میں جان، مال، آبرو، ہر چیز کی بازی لگادی ہے۔ اور بے شمار مواقع پر ان مختلف نظریات کے حامیوں میں ایسی سخت کشاکش ہوئی ہے کہ ایک نے دوسرے کو بالکل مٹا دینے کی کوشش کی ہے، اور مٹنے والے نے مٹتے مٹتے بھی اپنا نقطۂ نظر نہیں چھوڑا ہے۔ عقل چاہتی ہے کہ ایسے اہم اور سنجیدہ اختلافات کے متعلق کبھی تو صحیح اور یقینی طور پر معلوم ہو کہ فی الواقع ان کے اندر حق کیا ہے اور باطل کیا، راستی پر کون ہے اور ناراستی پر کون۔ اس دنیا میں تو کوئی امکان اس پردے کے اٹھنے کا نظر نہیں آتا۔ اس دنیا (باقی حاشیہ ۱۵ پر)

ع اس سے زیادہ کچھ کرنا نہیں ہوتا کہ اسے حکم دیں "ہو جا" اور بس وہ ہو جاتی ہے[1] ع
جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دینگے، اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے[2]۔ کاش جان لیں وہ مظلوم جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۵) کا نظام ہی کچھ ایسا ہے کہ اس میں حقیقت پر سے پردہ اٹھ نہیں سکتا۔ لہٰذا لامحالہ عقل کے اس تقاضے کو پورا کرنے کیلئے ایک دوسرا ہی عالم درکار ہے۔

اور یہ صرف عقل کا تقاضا ہی نہیں ہے بلکہ اخلاق کا تقاضا بھی ہے۔ کیونکہ ان اختلافات اور ان کشمکشوں میں بہت سے فریقوں نے حصہ لیا ہے، کسی نے ظلم کیا ہے اور کسی نے سہا ہے، کسی نے قربانیاں کی ہیں اور کسی نے قربانیوں کو وصول کیا ہے، ہر ایک نے اپنے نظریے کے مطابق ایک اخلاقی فلسفہ اور ایک اخلاقی رویہ اختیار کیا ہے اور اس سے اربوں اور کھربوں انسانوں کی زندگیاں برے یا بھلے طور پر متاثر ہوئی ہیں۔ آخر کوئی وقت تو ہونا چاہیئے جبکہ ان سب کا اخلاقی نتیجہ جزا یا سزا کی شکل میں مترتب ہو۔ اس دنیا کا نظام اگر صحیح اور مکمل اخلاقی نتائج کے ظہور کا متحمل نہیں ہے تو ایک دوسری دنیا ہونی چاہیئے جہاں یہ نتائج ظاہر ہو سکیں۔

[1] یعنی لوگ سمجھتے ہیں کہ مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ پیدا کرنا اور تمام اگلے پچھلے انسانوں کو بیک وقت جلا اٹھانا کوئی بڑا ہی مشکل کام ہے۔ حالانکہ اللہ کی قدرت کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے کسی ارادے کو پورا کرنے کے لئے کسی سر و سامان، کسی سبب و وسیلے، اور کسی سازگاریٔ احوال کا محتاج نہیں ہے۔ اس کا ہر ارادہ محض اس کے حکم سے پورا ہوتا ہے۔ اس کا حکم ہی سر و سامان وجود میں لاتا ہے، اس کے حکم ہی سے اسباب و وسائل پیدا ہو جاتے ہیں، اس کا حکم ہی اس کی مراد کے عین مطابق احوال تیار کر دیتا ہے۔ اس وقت جو دنیا موجود ہے یہ بھی مجرد حکم سے وجود میں آئی ہے، اور دوسری دنیا بھی آناً فاناً صرف ایک حکم سے ظہور میں آسکتی ہے۔

[2] یہ اشارہ ہے اُن مہاجرین کی طرف جو کفار کے ناقابلِ برداشت مظالم سے تنگ آکر مکہ سے حبش کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ منکرینِ آخرت کی بات کا جواب دینے کے بعد یکایک ربانی حاشیہ پہ،

رب کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں (کہ کیسا اچھا انجام ان کا منتظر ہے)۔

اے محمدؐ! ہم نے تم سے پہلے بھی جب کبھی رسول بھیجے ہیں آدمی ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم اپنے پیغامات وحی کیا کرتے تھے۔[1] اہلِ ذکر سے پوچھ لو اگر تم لوگ خود نہیں جانتے۔[2] پچھلے رسولوں کو بھی ہم نے روشن نشانیاں اور کتابیں دے کر بھیجا تھا، اور اب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ[3] جو ان کے لئے اتاری گئی ہے، اور تاکہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۶) مہاجرین حبشہ کا ذکر چھیڑ دینے میں ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے اس سے مقصود کفارِ مکہ کو متنبہ کرنا ہے کہ ظالمو! یہ جفاکاریاں کر چکنے کے بعد اب تم سمجھتے ہو کہ کبھی تم سے باز پرس اور مظلوموں کی دادرسی کا وقت ہی نہ آئے گا۔

[1] یہاں مشرکینِ مکہ کے ایک اعتراض کو نقل کیے بغیر اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔ اعتراض وہی ہے جو پہلے بھی تمام انبیاء پر ہو چکا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین نے بھی آپ پر بارہا کیا تھا کہ تم ہماری ہی طرح کے انسان ہو، پھر ہم کیسے مان لیں کہ خدا نے تم کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔

[2] یعنی علماء اہلِ کتاب اور وہ دوسرے لوگ جو چاہے سکہ بند علماء نہ ہوں مگر بہر حال کتبِ آسمانی کی تعلیمات سے واقف اور انبیاء سابقین کی سرگذشت سے آگاہ ہوں۔

[3] تشریح و توضیح صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی، اور اپنی رہنمائی میں ایک پوری مسلم سوسائٹی کی تشکیل کر کے اور "ذکرِ الٰہی" کے منشا کے مطابق اس کے نظام کو چلا کر بھی۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے وہ حکمت بیان کر دی ہے جس کا تقاضا یہ تھا کہ لازماً ایک انسان ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجا جائے۔ "ذکر"، فرشتوں کے ذریعہ سے بھی بھیجا جا سکتا تھا، براہِ راست چھاپ کر ایک ایک انسان تک بھی پہنچایا جا سکتا تھا۔ مگر محض ذکر بھیج دینے سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا جس کے لئے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت و ربوبیت اس کی تنزیل کا تقاضا کرتی ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری تھا کہ اس ذکر کو ایک قابل ترین انسان لے کر آئے۔ وہ اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ جن کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئے اس کا مطلب سمجھائے۔ جنہیں کچھ شک ہو ان کا (باقی صفحہ ۱۵۸ پر)

لوگ (خود بھی) غور و فکر کریں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۷) تنگ رفع کرے۔ جنہیں کوئی اعتراض ہو ان کے اعتراض کا جواب دے۔ جو نہ مانیں اور مخالفت اور مزاحمت کریں ان کے مقابلہ میں وہ رویہ برت کر دکھائے جو اس "ذکر" کے حاملین کی شان کے شایاں ہے۔ جو مان لیں انہیں زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو کے متعلق ہدایات دے، ان کے سامنے خود اپنی زندگی کو نمونہ بنا کر پیش کرے، اور ان کو انفرادی و اجتماعی تربیت دے کر ساری دنیا کے سامنے ایک ایسی سوسائٹی کو بطور مثال رکھ دے جس کا پورا اجتماعی نظام "ذکر" کے منشا کی شرح ہو۔

یہ آیت جس طرح اُن منکرینِ نبوت کی حجت کے لئے قاطع تھی جو خدا کا "ذکر" بشر کے ذریعہ سے آنے کو نہیں مانتے تھے، اُسی طرح آج یہ اُن منکرینِ حدیث کی حجت کے لئے بھی قاطع ہے جو نبی کی تشریح و توضیح کے بغیر صرف "ذکر" کو لے لینا چاہتے ہیں۔ وہ خواہ اس بات کے قائل ہوں کہ نبی نے تشریح و توضیح کچھ بھی نہیں کی تھی صرف ذکر پیش کر دیا تھا یا اس کے قائل ہوں کہ ماننے کے لائق صرف ذکر ہے نہ کہ نبی کی تشریح، یا اِس کے قائل ہوں کہ اب ہمارے لیے صرف ذکر کافی ہے نبی کی تشریح کی کوئی ضرورت نہیں، یا اس بات کے قائل ہوں کہ اب صرف ذکر ہی قابلِ اعتماد حالت میں باقی رہ گیا ہے نبی کی تشریح یا تو باقی ہی نہیں رہی یا باقی ہے بھی تو بھروسے کے لائق نہیں ہے، غرض ان چاروں باتوں میں سے جس بات کے بھی وہ قائل ہوں، ان کا مسلک بہرحال قرآن کی اس آیت سے ٹکراتا ہے۔ اگر وہ پہلی بات کے قائل ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی نے اس منشا ہی کو فوت کر دیا جس کی خاطر ذکر کو فرشتوں کے ہاتھ بھیجنے یا براہِ راست لوگوں تک پہنچا دینے کے بجائے اسے واسطۂ تبلیغ بنایا گیا تھا۔ اور اگر وہ دوسری یا تیسری بات کے قائل ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ میاں نے (معاذ اللہ) یہ فضول حرکت کی کہ اپنا "ذکر" ایک نبی کے ذریعہ سے بھیجا کیونکہ نبی کی آمد کا حاصل بھی وہی ہے جو نبی کے بغیر صرف ذکر کے مطبوعہ شکل میں نازل ہو جانے کا ہو سکتا تھا۔ اور اگر وہ چوتھی بات کے قائل ہیں تو دراصل یہ قرآن اور نبوت محمدی، دونوں کے نسخ کا اعلان ہے جس کے بعد اگر کوئی مسلک معقول باقی رہ جاتا ہے تو وہ صرف اُن لوگوں کا مسلک ہے جو ایک نئی نبوت اور نئی وحی کے قائل ہیں۔ (باقی صفحہ ۱۵۹ پر)

پھر کیا وہ لوگ جو (دعوتِ پیغمبر کی مخالفت میں) بدتر سے بدتر چالیں چل رہے ہیں اِس بات سے بالکل ہی بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ ان کو زمین میں دھنسا دے، یا ایسے گوشے سے اُن پر عذاب لے آئے جدھر سے اس کے آنے کا ان کو سان گمان تک نہ ہو یا اچانک چلتے پھرتے ان کو پکڑ لے، یا ایسی حالت میں انہیں پکڑے جبکہ انہیں خود آنے والی مصیبت کا کھٹکا لگا ہوا ہو اور وہ اس سے بچنے کی فکر میں چوکنے ہوں؟ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہے یہ لوگ اس کو عاجز کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی نرم خو اور رحیم ہے۔

اور کیا یہ لوگ اللہ کی پیدا کی ہوئی کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے کہ اس کا سایہ کس طرح اللہ کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۸) اس لئے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ خود قرآن مجید کے مقصدِ نزول کی تکمیل کے لئے نبی کی تشریح کو ناگزیر ٹھیرا رہا ہے اور نبی کی ضرورت ہی اس طرح ثابت کر رہا ہے کہ وہ ذکر کے منشا کی توضیح کرے۔ اب اگر منکرینِ حدیث کا یہ قول صحیح ہے کہ نبی کی توضیح و تشریح دنیا میں باقی نہیں رہی ہے تو اس کے دو نتیجے کھلے ہوئے ہیں۔ پہلا نتیجہ یہ ہے کہ نمونۂ اتباع کی حیثیت سے نبوت محمدی ختم ہوگئی اور ہمارا تعلق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف اُس طرح کا رہ گیا جیسا ہود اور صالح اور شعیب علیہم السلام کے ساتھ ہے کہ ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں، ان پر ایمان لاتے ہیں، مگر ان کا کوئی اُسوہ ہمارے پاس نہیں ہے جس کا ہم اتباع کریں۔ یہ چیز نئی نبوت کی ضرورت آپ سے آپ ثابت کر دیتی ہے، صرف ایک بے وقوف ہی اس کے بعد ختمِ نبوت پر اصرار کر سکتا ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ اکیلا قرآن نبی کی تشریح و تبیین کے بغیر خود اپنے بھیجنے والے کے قول کے مطابق ہدایت کے لئے ناکافی ہے، اس لئے قرآن کے ماننے والے خواہ کتنے ہی زور سے چیخ چیخ کر اسے کافی قرار دیں، مُدعی سست کی حمایت میں گواہانِ چُست کی بات ہرگز نہیں چل سکتی اور ایک نئی کتاب کے نزول کی ضرورت آپ سے آپ خود قرآن کی رُو سے ثابت ہو جاتی ہے۔ قاتلہم اللہ۔ اس طرح یہ لوگ حقیقت میں انکارِ حدیث کے ذریعہ سے دین کی جڑ کھود رہے ہیں۔

حضور سجدہ کرتے ہوئے دائیں اور بائیں گرتا ہے؟ سب کے سب اِس طرح اظہارِ عجز کر رہے ہیں۔
زمین اور آسمانوں میں جس قدر جاندار مخلوقات ہیں اور جتنے ملائکہ ہیں سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں۔
وہ ہرگز سرکشی نہیں کرتے، اپنے رب سے، جو اُن کے اوپر ہے، ڈرتے ہیں اور جو کچھ حکم دیا جاتا
ہے اسی کے مطابق کام کرتے ہیں۔ ع سجدۃ

اللہ کا فرمان ہے کہ "دو خدا نہ بنالو، خدا تو بس ایک ہی ہے، لہٰذا تم مجھی سے ڈرو۔" اُسی
کا ہے وہ سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اور خالصاً اُسی کا دین (ساری کائنات
میں) چل رہا ہے۔ پھر کیا اللہ کو چھوڑ کر تم کسی اور سے تقویٰ کروگے؟
تم کو جو نعمت بھی حاصل ہے اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ پھر جب کوئی سخت وقت تم پر آتا ہے
تو تم لوگ خود اپنی فریادیں لے کر اسی کی طرف دوڑتے ہو۔ مگر جب اللہ اس وقت کو ٹال دیتا ہے

---

۱ یعنی تمام جسمانی اشیاء کے سائے اس بات کی علامت ہیں کہ پہاڑ ہوں یا درخت، جانور ہوں یا انسان، سب کے سب ایک ہمہ گیر قانون کی گرفت میں جکڑے ہوئے ہیں، سب کی پیشانی پر بندگی کا داغ لگا ہوا ہے، اُلوہیت میں کسی کا کوئی ادنیٰ حصہ بھی نہیں ہے۔

۲ یعنی زمین ہی کی نہیں، آسمانوں کی بھی وہ تمام ہستیاں جن کو قدیم زمانے سے لے کر آج تک لوگ دیوی، دیوتا اور خدا کے رشتہ دار ٹھہراتے آئے ہیں دراصل غلام اور تابعدار ہیں، ان میں سے بھی کسی کا خداوندی میں کوئی حصہ نہیں۔

ضمناً اس آیت سے ایک اشارہ اس طرف بھی نکل آیا کہ جاندار مخلوقات صرف زمین ہی میں نہیں ہیں بلکہ عالمِ بالا کے سیاروں میں بھی ہیں۔

۳ دو خداؤں کی نفی میں دو سے زیادہ خداؤں کی نفی آپ سے آپ شامل ہے۔

۴ دوسرے الفاظ میں اسی کی اطاعت پر اس پورے کارخانۂ ہستی کا نظام قائم ہے۔

۵ بالفاظِ دیگر کیا اللہ کے بجائے کسی اور کا خوف اور کسی اور کی ناراضی سے بچنے کا جذبہ تمہارے نظامِ زندگی کی بنیاد بنے گا؟

۶ یعنی یہ توحید کی ایک صریح شہادت تمہارے اپنے نفس میں موجود ہے۔

تو یکایک تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو (اس مہربانی کے شکریے میں) شریک کرنے لگتا ہے[1] تاکہ اللہ کے احسان کی ناشکری کرے۔ اچھا، مزے کر لو، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔

یہ لوگ جن کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں[2] ان کے حصے ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے مقرر کرتے ہیں[3] ——— خدا کی قسم، ضرور تم سے پوچھا جائے گا کہ یہ جھوٹ تم نے کیسے گھڑ لیے تھے؟ یہ خدا کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں[4]۔ سبحان اللہ! اور ان کے لئے وہ جو یہ خود چاہیں[5]؟ جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا مٹی میں دبا دے؟ ——— دیکھو کیسے برے حکم ہیں جو یہ خدا کے بارے میں لگاتے ہیں[6]۔ بری صفات سے متصف کیے جانے

[1] یعنی اللہ کے شکریہ کے ساتھ ساتھ کسی بزرگ یا کسی دیوی دیوتا کے شکریے کی بھی نیازیں اور نذریں چڑھانی شروع کر دیتا ہے اور اپنی بات بات سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کے نزدیک اللہ کی اس مہربانی میں ان حضرت کی مہربانی کا بھی دخل تھا، بلکہ اللہ ہرگز مہربانی نہ کرتا اگر وہ حضرت مہربان ہو کر اللہ کو مہربانی پہ آمادہ نہ کرتے۔

[2] یعنی جن کے متعلق کسی مستند ذریعۂ علم سے انہیں یہ تحقیق نہیں ہوا ہے کہ اللہ میاں نے ان کو واقعی شریک خدا نامزد کر رکھا ہے، اور اپنی خدائی کے کاموں میں سے کچھ کام یا اپنی سلطنت کے علاقوں میں سے کچھ علاقے ان کو سونپ رکھے ہیں۔

[3] یعنی ان کی نذر، نیاز اور بھینٹ کے لئے اپنی آمدنیوں اور اپنی اراضی کی پیداوار میں سے ایک مقرر حصہ الگ نکال رکھتے ہیں۔

[4] مشرکین عرب کے معبودوں میں دیوتا کم تھے، دیویاں زیادہ تھیں۔ اور ان دیویوں کے متعلق ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ اسی طرح فرشتوں کو بھی وہ خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔

[5] یعنی بیٹے۔

[6] یہ حاشیہ صفحہ ۱۶۲ پر دیکھیں

کے لائق تو وہ لوگ ہیں جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے۔ رہا اللہ تو اس کے لئے سب سے برتر صفات ہیں، وہی تو
ع سب پر غالب اور حکمت میں کامل ہے۔ اگر کہیں اللہ لوگوں کو اُن کی زیادتی پر فوراً ہی پکڑ لیا کرتا تو روئے
زمین پر کسی متنفس کو نہ چھوڑتا لیکن وہ سب کو ایک وقتِ مقرر تک مہلت دیتا ہے، پھر جب وہ وقت
آجاتا ہے تو اس سے کوئی ایک گھڑی بھر بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ آج یہ لوگ وہ چیزیں اللہ کے لئے تجویز کر رہے ہیں
جو خود اپنے لئے انہیں ناپسند ہیں، اور جھوٹ کہتی ہیں ان کی زبانیں کہ ان کے لئے بھلا ہی بھلا ہے۔
ان کے لئے تو ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے دوزخ کی آگ، ضرور یہ سب سے پہلے اس میں پہنچائے جائینگے۔

خدا کی قسم، اے محمدؐ، تم سے پہلے بھی بہت سی قوموں میں ہم رسول بھیج چکے ہیں (اور پہلے بھی یہی ہوتا رہا
ہے کہ) شیطان نے ان کے بُرے کرتوت انہیں خوشنما بنا کر دکھائے (اور رسولوں کی بات انہوں نے مان کر
نہ دی)۔ وہی شیطان آج ان لوگوں کا بھی سرپرست بنا ہوا ہے اور یہ دردناک سزا کے مستحق بن رہے ہیں۔ ہم نے
یہ کتاب تم پر اس لئے نازل کی ہے کہ تم اُن اختلافات کی حقیقت اِن پر کھول دو جن میں یہ پڑے ہوئے
ہیں۔ یہ کتاب رہنمائی اور رحمت بن کر اتری ہے اُن لوگوں کے لئے جو اسے مان لیں۔[لہ]

(حاشیہ لہ صفحہ سابق) یعنی اپنے لئے جس بیٹی کو یہ لوگ اس قدر موجبِ ننگ و عار سمجھتے ہیں، اسی کو خدا کے لئے بلا تأمل تجویز
کر دیتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ خدا کیلئے اولاد تجویز کرنا بجائے خود ایک شدید جہالت اور گستاخی ہے، مشرکین عرب کی
اس حرکت پر یہاں اس خاص پہلو سے گرفت اس لئے کی گئی ہے کہ اللہ کے متعلق ان کے تصور کی پستی واضح کی جائے
اور یہ بتایا جائے کہ مشرکانہ عقائد نے اللہ کے معاملہ میں ان کو کس قدر جری اور گستاخ بنا دیا ہے اور وہ کس قدر بے حس
ہو چکے ہیں کہ اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے کوئی قباحت تک محسوس نہیں کرتے۔

لہ دوسرے الفاظ میں، اس کتاب کے نزول سے اِن لوگوں کو اس بات کا بہترین موقع ملا ہے کہ اوہام اور
تقلیدی تخیلات کی بنا پر جن بے شمار مختلف مسلکوں اور مذہبوں میں یہ بٹ گئے ہیں ان کے بجائے صداقت کی ایک
ایسی پائیدار بنیاد پالیں جس پر یہ سب متفق ہو سکیں۔ اب جو لوگ اتنے بے وقوف ہیں کہ اس نعمت کے آجانے
پر بھی اپنی سابقہ حالت ہی کو ترجیح دے رہے ہیں وہ تباہی اور ذلت کے سوا اور کوئی انجام دیکھنے والے نہیں ہیں۔
اب تو سیدھا راستہ وہی پائیگا اور وہی برکتوں اور رحمتوں سے مالامال ہوگا جو اس کتاب کو مان لیگا۔

عہدِ نبوت کے عمرانی اور تمدنی مسائل

(حکیم حمید زمان صاحب صدیقی)

(قسط دوم)

نظامِ تمدن کی ہیبت ناکیاں انسانی تمدن و اجتماع اگر کسی پاکیزہ اور بلند اخلاقی تصور پر مبنی نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ بہیمانہ طبقاتی نزاع، خود غرضانہ گروہ بندی، ملت کش مفاد پرستی، ظالمانہ سیاست اور معاشی نامساوات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اس بات کو کوئی مانے یا نہ مانے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ایسا پاکیزہ نصب العین دینِ حق کے سوا کسی دوسری جگہ سے دستیاب نہیں ہوتا اور جہاں دین کی روح کا فقدان ہو وہاں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ انسان اپنے مقصدِ وجود اور حقیقی نصب العین کو جان سکے۔ لیکن سطور بالا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ سرورِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کی تمام قومیں دین کی حقیقی روح سے محروم اور لذتِ حق پرستی سے ناآشنا تھیں اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی سیاست، معیشت اور عمران و تمدن کا پورا انتظام انتشار و فساد کی نذر ہو گیا تھا ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (الآیہ)

انسانی تاریخ کا یہ دور غیر الٰہی حاکمیت کے جبر و استبداد، سرمایہ پرستانہ ذہنیت کی سفاکی، ظالمانہ اور فاسقانہ معاشرت اور ہمہ گیر فسادِ انسانیت کا ایک ایسا ہیجانی دور تھا جس کی مثال ماضی کی پوری تاریخ میں مشکل ہی مل سکتی ہے۔ بادشاہوں کی قبائیں فاقہ کش اور مفلوک الحال عوام کے خونِ ناحق سے رنگین تھیں اور ان کے تختِ زرنگار ہزاروں انسانوں کی لاشوں پر بچھائے گئے تھے۔ امراء و حکام ان کا خون چوس رہے تھے، ہر طرف ظلم و معصیت کا طوفان بپا تھا، قلب و نظر کی صلاحیتیں مسخ ہو چکی تھیں، نیکی کو برائی اور برائی کو نیکی تصور کیا جانے لگا تھا، انسانی طبائع شر و فساد سے مانوس ہو چکی تھیں اور اخلاق و شرافت کے لئے دنیا کے کسی گوشہ میں پناہ گاہ نہ رہی تھی، اور حالت یہ کہ چند گنے چنے انسانوں کو چھوڑ

کہ کسی انسانی دل میں حق کی طلب و جستجو کی خواہش ہی باقی نہ رہی تھی ۔

مشرق خراب مغرب ازاں بیشتر خراب عالم تمام مردہ و بے ذوق جستجو

یہ حالات تھے جن میں خالق کائنات نے اپنے آخری نبی حضرت احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کے ذریعہ اس ظلمت کدۂ عالم کو نور ہدایت سے روشن کیا ۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی اقوام کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مفاسد کا سرسری جائزہ لیا جائے تاکہ اس سے اندازہ ہوسکے کہ آنحضرت صلعم کے زمانۂ بعثت میں اجتماعی اور تمدنی مسائل کی نوعیت کیا تھی اور آپ کو کن کن عملی مسائل سے سابقہ پڑا ؟ اس کے بعد ہم کسی ایک نتیجہ پر پہنچ سکیں گے کہ عصر حاضر کے انسانی مسائل وہی ہیں جو اس دور میں تھے یا ان سے مغائر ہیں ؟

زہرناک قومی تعصب اور بے قید سیاست بعثت نبوی کے وقت دنیا کی تمام چھوٹی بڑی قوموں کا اجتماعی کردار پستی کی انتہائی حد کو پہنچ گیا تھا۔ ان کی سیاست بے اصولے پن، نسل کشی، قومی عصبیت، تخریب پسندی، سفاکانہ حملہ و ہجوم اور بے دردانہ قتل و غارت کے لئے وقف تھی اور ان کے معاشی منصوبوں کا انحصار آوارہ گردی، غارت گری اور لوٹ مار کی متنوع اسکیموں پر تھا اور ان کی معاشرت ظالمانہ اور انسانیت کش قوانین پر مبنی تھی چنانچہ اس دور کی متمدن قوموں، روم و ایران اور ہند و چین کے حالات کا اگر جائزہ لیا جائے تو حیرانی ہوتی ہے کہ اگر تہذیب و تمدن اسی کا نام ہے تو پھر وحشت و بہیمیت کے لئے کونسا نام تجویز کیا جائے ؟

روما کی حکومت اس وقت دو بازوؤں میں تقسیم ہو چکی تھی "مغربی بازو" اور "مشرقی بازو" ۔ مغربی بازو اخلاقی طور پر تسفل و انحطاط کے انتہائی نقطہ پر پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ مشہور مسیحی مورخ گبن لکھتا ہے " اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین فنا بھی ہو جاتے تو ان کی تباہی سلطنت کے مغربی بازو کو زوال و تباہی سے نہیں بچا سکتی تھی ۔

نیز مورخ مذکور لکھتا ہے — رومن حکومت مخالفین کی نظر میں روز بروز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر میں زیادہ ظالم اور ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی، کفایت شعاری جتنی ضروری ہوتی جا رہی تھی ۔

اسی قدر اس کی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے اسی نسبت سے ٹیکسوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا[1]۔

اس سیاسی بدنظمی اور اخلاقی پستی کا نتیجہ تھا کہ جرمنی کی وحشی اقوام نے مغربی بازو کو کچل کر رکھ دیا اور گو ان حملہ آور جرمنوں نے عیسائیت قبول کر لی مگر قبول مذہب ان کے سفاکانہ اور وحشیانہ مظالم میں کوئی کمی نہ کر سکا۔

سلطنت روما کے مشرقی بازو کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔ چونکہ اس کی سرحدیں مملکت ایران سے ملتی تھیں اس لئے یہ ہمیشہ اہل ایران سے الجھا رہا اور پے در پے جنگوں نے اس کو بالکل نچوڑ دیا تھا۔ عہد نبوی کے آغاز میں ایرانیوں نے اہل روم کو عبرتناک شکست دی تھی اور ان کے اہم صوبوں مصر و شام و فلسطین پر قبضہ کر لیا تھا اور ۶ھ یعنی صلح حدیبیہ کے زمانہ میں رومیوں نے اہل ایران کو ایسی شکست دی کہ وہ پھر کبھی نہ سنبھل سکے لیکن بیزنطینیوں کے داخلی مفاسد نے ان کو اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ اس فتح عظیم سے فائدہ اٹھاتے۔

رومیوں اور ایرانیوں کی خونریز لڑائیوں میں جو چیز سب سے زیادہ افسوسناک تھی وہ یہ ہے کہ ان کی قومی عصبیت اور مذہبی جنون اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ انسانیت و شرافت کی کوئی قدر ان کی نظر میں مستحق احترام نہ رہی تھی اور مذہب و اخلاق کی پامالی کا خوفناک سے خوفناک منظر بھی ان کے دلوں کو پسیجنے کے لئے کافی نہ تھا۔ چنانچہ خسرو پرویز نے جب فلسطین پر حملہ کیا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ عیسائیوں کی عبادت گاہوں کو نذر آتش کر دیا اور بے دردی سے ہزارہا عیسائیوں کو تہ تیغ کیا۔ اور جو بچے کھچے تھے ان کو گرفتار کر لیا۔ اسی طرح رومی سلطنت کے حکمران ہرقل نے جب شمال کی طرف سے ایران پر حملہ کیا تو اس نے بھی جوابی طور پر مجوسیوں کے آتشکدوں کو برباد کیا اور لاکھوں انسانوں کا خون بہایا۔

یہ کوئی اتفاقی واقعات نہ تھے بلکہ یہ وحشت و بہیمیت اس دور کی اقوام کے قومی کردار کا

---

[1] تاریخ زوال و انحطاط روما جلد دوم

جزو لاینفک بن گئی تھی اور اس سے پہلے بھی بارہا اس قسم کے واقعات منظر عام پر آ چکے تھے۔ چنانچہ رسولِ عربی صلعم کی ولادت سے ایک سو سال پہلے کا ایک واقعہ جس کو اسلامی مؤرخین نے قلمبند کیا ہے یہ ہے کہ یمن کے ذونواس نامی یہودی بادشاہ نے نجران کے عیسائیوں کو جبری حکم دیا تھا کہ وہ عیسائیت چھوڑ کر یہودی بن جائیں اور اہل نجران کے انکار پر اس نے نجرانی عیسائیوں کو آگ کے دہکتے ہوئے شعلوں میں دھکیل دیا تھا۔[1] نجران کے کچھ لوگ جو اس آزمائش سے بچ نکلے تھے، حبشہ کے نجاشی کے پاس پہنچے اور داستانِ ظلم پوری کی پوری سنائی۔ نیز انجیل کے جلے ہوئے اوراق بھی دکھائے اور نجاشی سے انتقام کی درخواست کی۔ اس پر نجاشی نے قیصر سے مدد طلب کی اور بہت بھاری مسلح فوج لے کر یمن پر حملہ آور ہوا، ذونواس کو عبرتناک شکست ہوئی اور اب یمن پر باقاعدہ عیسائی حکومت قائم ہو گئی۔ لیکن ان عیسائی حکمرانوں میں سے ابرہہ نامی ایک حکمراں نے آنحضرت صلعم کی ولادت سے کچھ ہی دن پہلے کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کی غرض سے مکہ پر چڑھائی کی تھی جس کا اجمالی ذکر قرآن حکیم میں بھی موجود ہے۔

عیسائی حکومتوں میں یہودیوں پر جو مظالم ڈھائے جاتے تھے ان کے تصور ہی سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ خود پیروانِ مسیح کئی فرقوں میں بٹے ہوئے تھے اور ہر فرقہ اتنا متعصب اور تنگ نظر تھا کہ دوسرے فرقوں کی جان اور مال اس کے دست تعدی سے محفوظ نہ رہے تھے یہاں تک کہ برسر اقتدار طبقہ نے دوسرے فرقوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا چنانچہ گبن لکھتا ہے جب حکمران طبقہ سے مسلمانوں کی جنگ شروع ہوئی تو دوسرے فرقوں کے عیسائیوں نے باہر سے آنے والے اجنبی مسلمانوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور جی کھول کر اپنے ہم مذہبوں کے خلاف مسلمانوں کو مدد دی اور مسلمانوں کے ماتحت رہنا ان کو دوسرے عیسائی فرقوں کے ماتحت رہنے سے اچھا معلوم ہوتا تھا۔[2]

آنحضرت کی بعثت کے وقت چین اور ہندوستان جو ایشیائی ممالک میں اپنی قدیم تہذیب اور تاریخی عظمت کے اعتبار سے ممتاز سمجھے جاتے تھے، ایک عبوری دور سے گذر رہے تھے اور نہایت

---

[1] طبری ص ۹۲۵ ۔ [2] تاریخ زوال و انحطاط روما ۔

خطرناک قسم کی خانہ جنگیوں میں مبتلا تھے۔ ہند کے برہمنوں اور بدھ ازم کے علمبرداروں میں ایک مدت سے کشمکش چل رہی تھی اور بالآخر برہمنیت کے جبر و تشدد نے بدھ ازم کو ملک بدر کر دیا تھا اور آخر الذکر نے چین میں جا پناہ لی تھی لیکن چین میں پہلے سے فتنوں کی بھرمار تھی اور بڑی مشکل سے اس کو وہاں قدم جمانے کی اجازت ملی۔

یہ تو دوسری اقوام کے حالات تھے لیکن خود عرب قوم جس میں آنحضرت صلعم پیدا ہوئے اجتماعی اور سیاسی اعتبار سے اس کی حالت بھی کچھ کم تشویشناک نہ تھی۔ یہ ایسی خودسر قوم تھی کہ اس میں قومی مرکزیت کا کبھی احساس ہی نہیں پیدا ہوا تھا اور اس وجہ سے یہاں کوئی متحدہ عرب اسٹیٹ قائم نہ ہو سکا تھا۔ اس ملک میں بیسیوں قبائل آباد تھے اور ہر قبیلہ آزاد و خودمختار تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں اعیانیت کے طرز کی شہری مملکتیں قائم تھیں۔ پڑوس کے حکمرانوں کی للچائی ہوئی نگاہیں گاہے گاہے اس آزاد خطۂ ارضی کی طرف اٹھتی رہیں اور شاہان روم و ایران کی طرف سے بارہا کوشش کی گئی کہ اس خودسر قوم کو ہتھیا لیا جائے۔ لیکن وہ اس میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ چنانچہ عثمان بن الحویرث کو جب قیصر نے مکہ کی بادشاہت کی سند عطا کی اور اس نے واپس آ کر مکہ میں اعیان قریش کے اجتماع میں قیصر کا پیغام سنایا تو اس بات کے باوجود کہ اہل مکہ کا معاشی مفاد اہلِ روم و شام سے وابستہ تھا، انہوں نے کھلے طور پر انکار کر دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ اہلِ مکہ ہمیشہ سے آزاد و خودمختار رہے ہیں اور وہ ہرگز کسی کی آمریت کو پسند نہیں کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیصر نے مکہ والوں کو شام کے تجارتی سفر سے روک دیا، مگر یہ انتقامی اقدام بھی اہل مکہ کو بیرونی طاقت کی غلامی پر مجبور نہ کر سکا۔ غرض عربوں میں ایک طرف اگر یہ خوبی تھی کہ وہ حریت نواز اور جمہوریت پسند تھے تو دوسری طرف مرکزیت کے فقدان نے ان میں انتہائی درجہ کی بہیمیت، خودسری اور قبائلی عصبیت پیدا کر دی تھی اور اس جاہلی عصبیت نے سرزمین عرب کو صدیوں تک قتل و غارت اور سفاکی و خون آشامی کی آماجگاہ بنائے رکھا۔ اس ملک میں انسانی جان کی قیمت مکھی اور مچھر کے برابر بھی نہ تھی۔

نیز آزادانہ بدوی زندگی نے عربوں میں کچھ اچھے جوہر بھی پیدا کر دیئے تھے۔ مثلاً بہت، پامردی،

شجاعت و بسالت، عزتِ نفس، فیاضی کی قسم کی صفات ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئے تھے لیکن زندگی کا کوئی پاکیزہ تصور نہ ہونے کی وجہ سے ان کی یہ صفات اصلاح و تعمیر کی جگہ تخریب انسانیت کے لئے استعمال ہو رہی تھیں۔ ایک قبیلہ کے لوگ دوسرے قبیلہ والوں سے نہایت حقیر اور معمولی بات پر الجھ جاتے اور دونوں کی طرف سے سینکڑوں انسانی لاشیں فرشِ خاک پر ڈھیر ہو جاتیں چنانچہ بکر و تغلب کی مشہور لڑائی جو حرب بسوس کے نام سے متعارف ہے صرف اتنی سی بات پر چھڑ گئی تھی کہ بسوس نامی عورت کی اونٹنی دوسرے فریق کی چراگاہ میں داخل ہوئی اور اس نے پناہ دیتے ہوئے پرندوں کے انڈے توڑ دیئے، اس پر کلیب وائل نے اونٹنی کو ہلاک کر دیا اور اس کے نتیجہ میں بکر اور تغلب کی جنگ چھڑ گئی جو چالیس سال تک جاری رہی۔

قبیلوی عصبیت نے ان کو خیر و شر اور نیک و بد کے احساس و شعور سے بالکل بے نیاز کر دیا تھا۔ قتل و غارتگری، ظلم و معصیت، فحش کاری اور دیگر جرائم ان کی نگاہ میں عیب نہ تھے بلکہ قابلِ فخر کارنامے تصور کئے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک شاعر اپنی نسبت لکھتا ہے

وانی لا ازالُ اخاحروبٍ　　　اذالماجن کنتُ مجن جان

آنحضرت صلعم کے ایامِ جوانی میں قریش اور قبیلہ قیس کے درمیان بڑے عرصہ تک جنگ جاری رہی جو حرب فجار کے نام سے مشہور ہے اس جنگ نے دونوں طرف سے کئی خاندان برباد کر دیئے تھے۔ مدینہ کے قبائل اوس اور خزرج ہمیشہ باہم جنگ آزما رہتے تھے اور زمانۂ بعثت سے کچھ ہی عرصہ پہلے بعاث کی لڑائی سے فارغ ہوئے تھے۔

غرض عرب کی داخلی سیاست کی اصلاح کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہ تھا جو کسی سیاسی رہنما کی ذہنی اُپج سے حل ہو جاتا، اور اس پر مستزاد یہ کہ عرب کا محل وقوع بھی ایسا تھا کہ وہ ہر طرف سے اس وقت کی بڑی طاقتوں میں گھرا ہوا تھا۔ اور ان متمدن طاقتوں کے سیاسی اور معاشی دباؤ سے عرب بڑی حد تک متاثر تھے۔ اس کی تفصیل کے لئے عرب کے تاریخی پس منظر کو سامنے لانا ضروری ہے عرب کسی زمانہ میں ایشیا و یورپ کے ممالک کے لئے تجارتی گذرگاہ کی حیثیت رکھتا تھا اور خود عربوں کی

زیست کا ذریعہ بھی بیرونی تجارت ہی تھی۔ عرب ہمیشہ سے تجارت کی غرض سے بیرونی ممالک مصر و شام، مشرقی افریقہ، عراق و فلسطین اور ہند و چین کا سفر کرتے تھے بلکہ عرب کی قدیم تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ روم خیز خطۂ ارضی اپنے باشندوں کو آب و دانہ کے لئے ہمیشہ باہر دھکیلتا رہا ہے۔ اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ عرب کی سرزمین کا بڑا حصہ پیداوار کی کمی کی وجہ سے خود مکتفی نہ تھا اور ان لوگوں کو طوعاً و کرہاً معاشی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے اپنی بے آب و گیاہ مرز بوم کو چھوڑ کر سرسبز و شاداب ممالک کا رُخ کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ عرب کی قدیم ترین تاریخ گواہ ہے کہ حضرت مسیح سے دو تین ہزار سال قبل عرب کی کچھ قومیں صحرائے عرب سے نکل کھڑی ہوئیں اور انسانی آبادیوں کو پامال کرتی ہوئی آندھی کی طرح آناً فاناً دنیا کے بہت بڑے حصہ پر چھا گئیں۔ ان قوموں نے بیشتر ممالک مثلاً مصر و شام، مشرقی افریقہ، ایران و عراق، قرطاجنہ، کریٹ اور یونان کو زیرنگیں کیا اور بڑی بڑی مملکتیں قائم کیں۔ چنانچہ ابن خلدون نے لکھا ہے:-

وکان لھذہ الامم ملوک ودول فی جزیرۃ العرب وامتد ملکھم فیھا الی شام ومصر فی شعوب منھم (تاریخ ابن خلدون جلد ۲)	ان اقوام میں کئی بادشاہ ہو گزرے ہیں۔ جزیرۂ عرب میں ان کی بڑی بڑی سلطنتیں قائم تھیں اور ان کے کچھ قبائل کی وسعتِ مملکت مصر و شام تک پہنچ گئی تھی۔

یہ قومیں وہی ہیں جن کو قرآن حکیم نے عادِ اولیٰ کے نام سے موسوم کیا ہے اور قدیم عربی تاریخ میں عرب عاربہ (خالص عرب) اور عرب بائدہ (نیاہ ہونے والے عرب) کے ناموں سے متعارف ہیں۔ اور اُمم سامیۂ اولیٰ میں سے جو لوگ عرب ہی میں رہ گئے تھے انہوں نے عرب کے شمال میں عظیم مملکت قائم کی تھی۔ قرآن حکیم نے ان کو "ثمود" کا نام دیا ہے۔

زمانہ کی نیرنگیوں نے قوموں کو ایک ہی حال میں کب رہنے دیا ہے؟ شاید یہ بات منشائے خداوندی کے خلاف ہے کہ ایک ہی قوم ہمیشہ کے لئے انسانی دنیا پر مسلط رہے، اس لئے اس قوم کا اقتدار بھی آخر کچھ حامی النسل قوموں کے ہاتھوں ختم ہوا۔

یقال انھم انتقلوا الی جزیرۃ العرب من بابل لما زاحمھم فیھا بنو حام۔ (کتاب العبر جلد ۱)	کہا جاتا ہے کہ وہ بابل سے جزیرۂ عرب کی طرف منتقل ہو گئے جبکہ حامی النسل لوگوں نے ان کو مار بھگایا۔

اسی طرح مصر میں قبطی اقوام نے نئی حکومت قائم کر لی اور دوسرے ممالک میں بھی ان کا شاہانہ اقتدار مٹ گیا۔ ان کے بعد عراق، یمن، شام میں مختلف قومیں برسرِ عروج رہیں۔ یہاں تک کہ رومی عیسائی سلطنت نے مصر، شام اور فلسطین پر تسلط قائم کر لیا۔ اور عراق و یمن اہلِ فارس کے زیرِ نگیں آ گئے۔ لیکن چونکہ ایران و روم میں مسلسل آویزش رہتی تھی اور اس کے علاوہ عرب کے خانہ بدوش بدوی قبائل عراق اور شام میں داخل ہو کر لوٹ مار کرتے تھے اس لئے ایرانی حکومت نے مصلحت اندیشی کے طور پر عراق میں عرب اسٹیٹ قائم کر دیا اور رومانے دمشق میں عربوں کی ایک ریاست قائم کر دی۔ یہ ریاستیں جن سیاسی اغراض کے لئے قائم ہوئی تھیں اُن کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوئیں اور نہ صرف یہ کہ ان سرحدی ریاستوں نے حاجز مملکت (بفر اسٹیٹ) کا کام دیا اور ایرانی و بیزنطینی عرب بدوؤں کے غارت گرانہ حملوں سے محفوظ ہو گئے بلکہ ایران و روم کی جنگوں میں ان ریاستوں کے لوگ اپنے اپنے اقتدارِ اعلیٰ کے ماتحت سر دھڑ کی بازی لگا دینے اور میدانِ جنگ میں پیش پیش رہتے تھے۔ بالآخر بیزنطینیوں کا اثر و نفوذ یہاں تک بڑھا کہ شمالی عرب کے بہت سے قبائل مثلاً دومۃ الجندل، اذرح، جربا وغیرہ نے عیسائیت قبول کر لی۔ اور بیزنطینی حکومت نے یہاں بھی کچھ عرب سرداروں کی ریاستیں قائم کر دیں اور اس طرح اس نے اپنے آپ کو محفوظ بنا لیا تھا۔ اسی طرح عراق اور یمن پر ایرانی تسلط بھی دعوتِ نبوی کے لئے مستقل خطرہ تھا۔

غرض عرب کی خارجی سیاست کچھ اس قدر پیچیدہ تھی کہ محض سیاسی بصیرت اور عقل و تدبیر سے اس کو حل نہ کیا جا سکتا تھا بلکہ اس کے لئے پیغمبرانہ بصیرت اور الہامی طریق کار کی ضرورت تھی۔ مذکورہ مسائل کے علاوہ عرب اور بیرونِ عرب کا معاشی مسئلہ بھی کچھ کم اہمیت نہ رکھتا تھا اور یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جو ملک سیاسی لحاظ سے شدید انتشار و ابتری کا شکار ہو یا پے بہ پے جنگوں نے اس کے ملکی نظام کو درہم برہم کر دیا ہو وہاں معاشی خوشحالی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر آمرانہ طرزِ حکومت میں دولت کی نامساویانہ تقسیم ایک ناگزیر اور طبعی چیز ہے اور ظاہر ہے کہ اس وقت تمام دنیا کی قومیں مطلق العنان حکمرانوں یا قبائلی سرداروں کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوئی تھیں۔

یہ باتیں تو تمام ممالک میں مشترک تھیں لیکن عرب کا معاشی مسئلہ دوسرے ممالک کی نسبت سے

بہت زیادہ اُلجھا ہوا تھا بلکہ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے ملک کے پیداواری ذرائع کے فقدان نے عربوں کو ہمیشہ پریشان حال رکھا۔ اس ملک کی پیداوار کھجور تھی۔ بعض علاقوں میں غلہ کی کاشت ہوتی تھی لیکن وہ اتنی نہ تھی کہ دوسرے علاقوں کے لئے برآمد کی جاسکے، نیز بکریوں اور اونٹنیوں کا دودھ بھی صحرائی لوگوں کی غذا کے کام آتا تھا۔ زیادہ تر یہ لوگ لوٹ مار اور غارت گری کے ذریعہ تو شکم کے لئے ایندھن مہیا کرتے تھے۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ اگر ان کو چولھے کے لیے پتھر کی ضرورت ہوتی تو کسی مکان کی دیوار توڑ لیتے اور اگر لکڑی کی ضرورت پڑتی تو کسی مکان کی چھت اکھاڑ لیتے۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری اخلاقی نقطۂ نظر سے خواہ کتنی ہی معیوب کیوں نہ ہو لیکن ان کی نظر میں معیوب نہ تھی بلکہ ان کو اپنے اس ظالمانہ کردار پر ناز تھا، اور اس کے علاوہ کچھ لوگوں کا ذریعہ معاش بیرونی ممالک کی تجارت تھی۔

نیز ملک کے طول و عرض میں یہودی سرمایہ دار پھیلے ہوئے تھے، تجارت کی اہم منڈیوں پر ان کا قبضہ تھا اور اس کے علاوہ یہ لوگ وسیع پیمانہ پر سودی کاروبار بھی کرتے تھے، عرب عوام ان کے قرضوں کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے اور یہودی بنئے نہایت گراں شرح سود پر قرضے دیتے تھے۔ ان درندہ صفت انسانوں کی سنگدلی کا یہ حال تھا کہ ضمانت کے طور پر لوگوں کے بچوں اور عورتوں کو گرو رکھتے تھے۔

اس اجمالی بیان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس ملک کے عوام کی معاشی زندگی حد درجہ پست تھی اور قوم کو اس خوفناک افلاس و فاقہ مستی سے نکالنا ملک کا اہم اجتماعی و ملی سوال تھا۔

عربوں کے معاشرتی رسم و رواج اور اخلاقی و مجلسی مفاسد اس درجہ گہرے اور خطرناک تھے کہ عام حالات میں ان کی اصلاح کی کوئی توقع نہ ہوسکتی تھی۔ بلند و پست، اونچ نیچ اور شریف و وضیع کا امتیاز ان کی قومی روایات میں غیر معمولی اہمیت رکھتا تھا اور اخلاقی و مجلسی مفاسد کی تو کوئی حد ہی نہ تھی یہ مسئلہ ایک مستقل موضوع بحث ہے اور ان کے تفصیلی گوشوں سے بحث کرنا اس موقع پر مشکل ہے یہاں صرف ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا۔

طائف کی سفارت نے جب آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف باریابی حاصل کیا تو انہوں نے کہا ہم اس شرط پر اسلام قبول کرتے ہیں کہ ہمارے یہ مطالبات تسلیم کئے جائیں پہلے یہ کہ زنا

ہمارے لئے جائز رکھی جائے کیونکہ ہم میں اکثر لوگ مجرد زندگی بسر کرتے ہیں اور زنا کے بغیر ان کو چارہ نہیں۔ دوسرے شراب سے منع نہ کیا جائے کیونکہ یہ ہماری قومی تجارت ہے۔ تیسرے سودی کاروبار کی مخالفت سے ہمیں مستثنیٰ کیا جائے۔ کیونکہ یہ ہمارا ذریعۂ معاش ہے۔ آنحضرت صلعم نے یہ تمام شرطیں نامنظور کیں۔ لیکن اس واقعہ سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی مجلسی زندگی کس قدر بے لگام اور معصیت آلود تھی۔

عرب کے علاوہ دوسرے ممالک کا بھی یہی حال تھا۔ مثال کے طور پر ہندوستان ہی کو لیجئے۔ یہاں ذات پات کی تفریق اور نامنصفانہ مجلسی قوانین نے آبادی کو کئی طبقوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کسی اونچی ذات کا مرد اگر کسی نیچی ذات کی عورت سے زنا کرتا تو اس کے لئے کوئی سزا نہ تھی لیکن کسی اعلیٰ ذات کو اچھوت نسل کا آدمی چھو لیتا تو اس کی سزا موت تھی۔ اس ملک کی اخلاقی پستی کا یہ عالم تھا کہ عورتیں جوئے میں ہاری جاتی تھیں۔ ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے تھے۔ قومی تہواروں میں شراب کے دور چلتے تھے اور نشہ کی حالت میں ماں، بہن اور بیٹی کی تمیز نہ رہتی تھی اور اس پر طرفہ یہ کہ اس کام کو نیکی کا کام تصور کیا جاتا تھا۔

یہود کے اخلاقی اور مجلسی مفاسد کو قرآن حکیم نے بالوضاحت بیان کیا ہے۔

نتائج بحث و فکر گذشتہ بحث سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ رسول عربی صلعم کی بعثت کے وقت انسانی زندگی کے اجتماعی مفاسد کیا تھے؟ ان مفاسد پر دوبارہ سرسری نگاہ ڈالئے تاکہ آپ کو ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو سکے کہ عصر حاضر کے اجتماعی مفاسد کو اس دور کے مفاسد سے کیا نسبت ہے۔

(۱) بے مقصد اور بے روح مذہبیت: یعنی اس دور کی تمام قومیں اگرچہ کسی نہ کسی مذہب کی پیرو تھیں، لیکن اس کے باوجود ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی دین کی روح سے بالکل تہی مایہ تھی اور یہی وہ بنیادی فساد تھا جس نے ان لوگوں کی نگاہ سے زندگی کا حقیقی تصور بالکل اوجھل کر دیا تھا۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو دیگر تمام مفاسد کا سرچشمہ یہی ہے۔

(۲) شدید نسلی و قومی تعصب۔ اس دور میں سطح ارضی پر سینکڑوں چھوٹی بڑی قومیں آباد تھیں

اور ہر قوم اس زعم میں مبتلا تھی کہ عظمت و شرف اور فضیلت و منقبت کے تمام محاسن و کمالات صرف اسی کے لئے مخصوص ہیں اور دوسرے لوگ محض اس کی محکومی اور فرمانبرداری کے لئے پیدا ہوئے ہیں یعنی ہر قوم یہ عقیدہ رکھتی تھی کہ مخلوق خدا پر خدائی کرنے کا حق اسی کو حاصل ہے اور دوسری قوموں کا بس یہی کام ہے کہ اس کی بندگی کریں۔

(۳) بے قید سیاست یعنی اس دور میں زندگی کا اجتماعی اور سیاسی نظام دین کی پابندی سے بالکل آزاد تھا اور اس ثنویت نے قوموں کی اجتماعی زندگی میں مہلک جراثیم پیدا کر دیے تھے۔

(۴) دولت کی نامنصفانہ تقسیم

(۵) ظالمانہ معاشرتی اور مجلسی رسم و رواج۔

اس تفصیل سے آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اس دور کے عملی مسائل کیا تھے اور اس بات کو سمجھنا بھی کچھ مشکل نہیں کہ دورِ حاضر کے عملی مسائل بنیادی حیثیت سے دورِ رسالت کے مسائل سے مختلف نہیں ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ چودہ سو سال پہلے کے انسانی دور اور موجودہ دور میں کچھ فرق نہیں ہے۔ یقیناً فرق ہے اور ہونا چاہیے۔ لیکن سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ صرف اتنا ہی ہے کہ انسانیت کے حقیقی اور بنیادی مسائل میں چودہ سو سال گذرنے کے بعد بھی کوئی فرق نہیں پڑا یقیناً آج بھی پیروانِ مذاہب، مذہب کی حقیقی سپرٹ سے بالکل محروم ہیں، اور ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو دیکھ کر کسی کو یقین نہیں آسکتا کہ یہ کسی دین کے پیرو ہیں۔ اسی طرح اقوام حاضرہ کا نسلی اور قومی تعصب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ دین و سیاست کی جدائی ایک مستقل عقیدہ بن چکی ہے۔ معاشی نامساوات اور معاشرتی مفاسد بھی انسانی سوسائٹی میں گہرا اثر پیدا کر چکے ہیں۔ لہٰذا جب انسانیت کا مرض وہی ہے جو چودہ سو سال پہلے تھا تو علاج بھی وہی کیوں نہ ہو جو پہلے ایک مرتبہ آزمایا جا چکا ہے۔ یعنی آج اگر ہم دیانت داری سے ان مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ایک تابناک مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔

رسائل و مسائل

خاتم النبیین کے بعد دعوائے نبوت

سوال:- "ترجمان القرآن" (جنوری، فروری) کے صفحہ ۲۳۶ پر آپ نے لکھا ہے کہ "میرا اب تک کا تجربہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی جھوٹ کو فروغ نہیں دیتا۔ میرا ہمیشہ سے یہ قاعدہ رہا ہے کہ . . . . جن لوگوں کو میں صداقت و دیانت سے بے پروا اور خوفِ خدا سے خالی پاتا ہوں، ان کی باتوں کا کبھی جواب نہیں دیتا . . . . خدا ہی ان سے بدلہ لے سکتا ہے . . . . . اور ان کا پردہ انشاء اللہ دنیا ہی میں فاش ہوگا۔"

میں عرض کروں کہ میں نے جماعت احمدیہ کے لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے کام سے دلچسپی ہے۔ میرے مندرجہ ذیل استفسارات اسی ضمن میں ہیں:-

۱- یہ صرف آپ ہی کا تجربہ نہیں، بلکہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "اللہ تعالیٰ کاذبوں سے محبت نہیں کرتا" اور "اللہ کی لعنت ہے جھوٹوں پر" اور پھر اس قسم کے جھوٹوں پر کہ "ولو تقول علینا بعض الاقاویل ــــــ" ان کی سزا تو فوری گرفت اور وصالِ جہنم ہے (لاخذنا منه باليمين ثم لقطعنا منه الوتين۔ حاقہ ۱) اس صورت میں اگر مرزا صاحب جھوٹے تھے تو کیا وجہ ہے کہ (ا) ابھی تک اللہ تعالیٰ نے ان پر کوئی گرفت نہیں کی؟ (ب) ان کی جماعت بڑھ رہی ہے اور مرزا صاحب کے مشن کو جو مسلمانوں کے نزدیک گمراہ کن ہے، تقویت پہنچ رہی ہے اور اب تو اس جماعت کی جڑیں بیرونی ممالک میں مضبوط ہوگئی ہیں (ج) مرزا صاحب کے پیغام کو ساٹھ سال ہوگئے ہیں۔ ہم کب تک خدائی فیصلے کا انتظار کریں؟ فی الحال تو وہ ترقی کر رہے ہیں (د) جو جماعتیں یا افراد اس گروہ کی مخالفت کر رہے ہیں وہ کیوں اسے ترک نہیں

کر دیتے۔ اور معاملہ خدا پر نہیں چھوڑ دیتے؟

۵۔ صفحہ ۲۴۲ پر آپ کی جماعت کے ایک جرمنی نژاد مسلم نے برلن میں جماعت احمدیہ کے ساتھ تبلیغ اسلام میں تعاون کا ذکر کیا ہے۔ اگر آپ بھی ان کی تبلیغ اسلام کو صحیح سمجھتے ہیں، تو پاکستان میں ان کے ساتھ تعاون کیوں نہیں کرتے؟

جواب:۔ آپ جس سرسری نظر سے ایک مدعی نبوت کے معاملے کو دیکھ رہے ہیں، یہ طریقہ ایسے اہم معاملے پر رائے قائم کرنے کے لئے موزوں نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ تو سراسر ایک جھوٹے الزام کے بارے میں تھا جو بعض خود غرض لوگوں نے میرے اوپر لگایا تھا۔ اس بات کو آپ چسپاں کر رہے ہیں ایک ایسے شخص کے معاملے پر جس نے خود نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ آپ کو سمجھنا چاہئے کہ ایک مدعی نبوت کے معاملے میں لامحالہ دو صورتوں میں سے ایک صورت پیش آتی ہے: اگر وہ سچا ہے تو اس کو نہ ماننے والا کافر، اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کو ماننے والا کافر۔ ایک ایسے نازک معاملے کا فیصلہ آپ صرف اتنی سی بات پر کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی تک ان پر کوئی گرفت نہیں کی، اور ان کی جماعت بڑھ رہی ہے، اور یہ کہ ہم کب تک خدائی فیصلہ کا انتظار کریں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے اور اس کی جماعت ترقی کرتی نظر آئے اور آپ کی تجویز کردہ مدتِ انتظار کے اندر اس پر خدا کی طرف سے گرفت نہ ہو تو بس یہ باتیں اس کو نبی مان لینے کے لئے کافی ہیں؟ کیا آپ کے ذہن میں نبوت کو جانچنے کے یہی معیار ہیں؟

آیت ولو تقول علینا بعض الاقاویل سے جو استدلال آپ نے کیا ہے وہ بنیادی طور پر غلط ہے۔ اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ محمد صلعم جو حقیقت میں اللہ کے نبی ہیں اگر خدا کی وحی کے بغیر کوئی بات خود تصنیف کر کے خدا کے نام سے پیش کریں تو ان کی رگ گلو کاٹ دی جائے گی۔ اس سے یہ معنی نکالنا صحیح نہیں ہے کہ جو شخص حقیقت میں نبی نہ ہو اور غلط طور پر اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے پیش کرے اس کی رگ گلو بھی کاٹی جائے گی۔ اور نہ اس آیت

میں اللہ تعالیٰ نے سچے اور جھوٹے نبی کی پہچان کے لئے یہ بات بطور ایک معیار کے پیش کی ہے کہ جس مدعیٔ نبوت کی رگِ گلو نہ کاٹی جائے وہ سچا نبی ہے اور جس کی رگ کاٹ دی جائے وہ جھوٹا مدعی۔ قرآن کی آیتوں میں تاویل کی یہ کھینچ تان، جو ظاہر ہے کہ آپ کی اپنی اُپج کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ مرزا صاحب کی جماعت سے ہی آپ نے سیکھی ہے، بجائے خود اس بات کی علامت ہے کہ یہ جماعت خوفِ خدا سے کس قدر خالی ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے اس کی بات کو ان معیاروں پر نہیں جانچا جائے گا جو آپ نے پیش کئے ہیں بلکہ اسے پورے اطمینان کے ساتھ اس بنیاد پر رد کر دیا جائے گا کہ قرآن و احادیثِ صحیحہ اس معاملے میں قطعی ناطق ہیں کہ آنحضرت صلعم کے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ میں ان دلائل سے بھی واقف ہوں جو مرزا صاحب اور ان کے متبعین نے بابِ نبوت کے کھلے ہونے پر قائم کئے ہیں۔ مگر میں آپ سے صاف عرض کرتا ہوں کہ ان دلائل سے اگر کوئی متاثر ہو سکتا ہے تو وہ صرف ایک بے علم یا کم علم آدمی ہی ہو سکتا ہے۔ ایک صاحب علم آدمی کو تو ان کے دلائل دیکھ کر صرف ان کے جہل ہی کا یقین حاصل ہوتا ہے۔

ترجمان القرآن میں جرمنی کا جو مکتوب شائع ہوا ہے اس کی اشاعت کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی ہر بات ہمارے نزدیک سچی ہے۔ ہمارا مدعا تو یہ تھا کہ ہمارے ملک کے مسلمانوں کو اپنے جرمن نومسلم بھائیوں کی حالت سے آگاہ کیا جائے اور ان کی مدد پر اکسایا جائے۔ وہ لوگ بیچارے نئے نئے مسلمان ہیں، ان کو کیا خبر کہ دنیائے اسلام میں کس کس قسم کے فتنے اٹھ رہے ہیں۔ ان کو تو اسلام کے نام سے جو چیز جہاں سے بھی ملے گی وہ اس سے اپنی تشنگی بجھانے کی کوشش کریں گے یہ ہمارا کام ہے کہ انھیں اسلام کے متعلق صحیح لٹریچر فراہم کر کے دیں۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ بے چارے ناواقفیت میں کسی فتنے کے شکار نہ ہو جائیں۔

سوال: آپ کا جواب ملا۔ افسوس کہ وہ میری تشفی کے لئے کافی نہیں ہے۔

میں نے آپ ہی کی دی ہوئی حقیقت "خدا تعالیٰ خود جھوٹے کو سزا دیگا" کی روشنی میں پوچھا تھا کہ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی جو سب مسلمانوں کے نزدیک کاذب ہیں ان پر کیوں خدا تعالیٰ کی گرفت نہیں ہوتی، اور یہ کہ خدا تعالیٰ کس طرح اپنے بندوں کو اتنے عرصے سے گمراہ ہوتے دیکھ رہا ہے؟

میں مرزا صاحب کی تصنیف کردہ تقریباً ۲۵ کتب تحقیقی نظر سے دیکھ چکا ہوں۔ اور اس کے بعد علمائے اسلام کی بعض کتب بھی ان کے ردّ میں دیکھی ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے آپ کی کوئی کتاب اس موضوع پر نہیں پڑھی۔ ویسے علماء کی کتب کے متعلق میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ:-

انہوں نے مرزا صاحب کی تحریروں میں تحریف کر کے غلط مطالب ان کی طرف منسوب کئے ہیں۔

جس موضوع پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے اس پر انہیں عبور نہیں تھا۔

بعد میں میری خط و کتابت پر یہ لوگ عموماً خاموش رہے ہیں۔

مرزا صاحب کی کتب سے میں جو کچھ سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کی ذات اور اقوال یعنی ظاہر و باطن آنحضور صلعم کے عشق سے پُر ہے۔ میں اس بنیاد کو لے کر مرزا صاحب کے دعوے کی طرف بڑھا تھا اور اب مجھ پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ:-

۱۔ مرزا صاحب کے دعاوی قرآن اور اقوالِ نبویؐ کے خلاف نہیں۔

۲۔ مرزا صاحب کی نبوت آنحضرتؐ کی شان گھٹانے کے لئے نہیں، بلکہ اگر موسوی فیضان سے قریہ قریہ نبی ہو سکتے ہیں تو مقامِ محمدی کے مطابق گاؤں گاؤں ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو بتائیں کہ ہم نے شریعتِ محمدیہ پر عمل کر کے مکالمۂ الٰہیہ حاصل کیا ہے۔ خود مرزا صاحب نے فرمایا ہے کہ:

"ایں چشمۂ رواں کہ بخلقِ خدا دہم یک قطرۂ ز بحرِ کمالِ محمدؐ است"

اب آپ نے پھر مجھے مرزا صاحب کے دعوے کو پرکھنے کی اجازت دی ہے۔ کیا آپ براہِ کرم قرآن کریم سے میری رہنمائی کے لئے مرزا صاحب کے کسی ایک دعوے کو جھوٹا ثابت کر دیں گے؟

جواب:- پچھلا خط آپ کی تشفی کے لئے کافی ہو جاتا، اگر آپ تشفی چاہتے۔ میں نے

ترجمان القرآن میں جو کچھ لکھا تھا وہ تو ان لوگوں کے بارے میں تھا جو مجھ پر ایک جھوٹا بہتان لگا رہے ہیں اور اس میں اللہ تعالیٰ پر یہ اعتماد ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ ضرور جھوٹوں کو سزا دیگا۔ مگر آپ اسے ایک مدعی نبوت کے دعوے کو جانچنے کے لئے معیار ٹھیرا رہے ہیں اور معیار بھی اس شان کے ساتھ کہ اگر مدعی کو سزا ملتی ہوئی نظر نہ آئے تو ضرور وہ اپنے دعوے میں سچا ہے۔ آپ خود سوچیں کہ میرے قول کو مجھ پر حجت بنانے کی یہ کوشش جو آپ نے فرمائی ہے یہ آخر کہاں تک معقول ہے۔ کیا میں نے اپنے خلاف بہتان لگانے والوں کے متعلق یہ بھی کہا تھا کہ اگر انہیں دنیا میں سب کی آنکھوں کے سامنے سزا نہ ملے تو ضرور مجھ پر اُن کا بہتان سچا ہے؟ کیا واقعی لوگوں کے صادق و کاذب اور راہ یاب و گمراہ ہونے کے لئے یہ کوئی صحیح معیار ہے کہ جسے دنیا میں سزا مل جائے وہ جھوٹا اور گمراہ، اور جسے سزا نہ ملے وہ سچا اور ہدایت یافتہ؟

آپ عجیب بات فرما رہے ہیں کہ مرزا صاحب کے دعوے کو ۶۰ سال گذر چکے ہیں، آخر کب تک کوئی انتظار کرے۔ دعوائے نبوت کی صداقت کو پرکھنے کی یہ عجیب کسوٹی جو آپ نے تجویز فرمائی ہے ذرا اس کی توضیح تو فرمائیے کہ ایک جھوٹے مدعی کو آپ کے نزدیک کس قسم کی سزا ملنی چاہیئے؟ اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ غیب سے ایک ہاتھ بڑھے اور اس کی رگ گلو کاٹ دے، تو میں عرض کرونگا کہ یہ سزا تو مسیلمہ تک کو نہیں ملی جس نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اور اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ جو مدعیٔ نبوت انسانوں کے ہاتھ سے مارا جائے وہ جھوٹا ہے تو اُن انبیاء کے متعلق آپ کیا فرمائیں گے جن کی نبوت کی تصدیق خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی فرما دیا ہے کہ ان کی قوم نے انہیں قتل کر دیا؟ قرآن میں یہ آیات تو آپ کی نظر سے گذری ہی ہونگی کہ قل قد جاءکم رسل من قبلی بالبینٰت وبالذی قلتم فلم قتلتموھم ان کنتم صٰدقین (آل عمران رکوع ۱۹) اور فبما نقضھم میثاقھم وکفرھم بآیات اللہ وقتلھم الانبیاء بغیر حق (النساء رکوع ۲۲)۔ ان آیات کی روشنی میں آپ کو ایک مرتبہ پھر اپنے انداز فکر پر نظر ثانی کرنی چاہیئے۔ نبی کا دعویٰ اس طرح کے معیاروں پر

نہیں جانچا جاتا۔ دیکھنے کی چیز تو یہ ہے کہ اس سے پہلے آئے ہوئے کلامِ الٰہی کی روشنی میں اس کا مقام کیا ہے؟ وہ چیز کیا لایا ہے؟ اور اس کی زندگی کیسی ہے؟ ان معیاروں پر کوئی شخص پورا نہ اترتا ہو تو آپ سخت غلطی کریں گے اگر اس کے دعوے کو صرف اس بنا پر مان لیں گے کہ آپ کی آنکھوں نے اسے اس دنیا میں سزا ملتے نہیں دیکھا۔

جو تین معیار میں نے اوپر بیان کئے ہیں ان میں سے موخر الذکر دو معیار ایسی صورت میں سرے سے قابلِ لحاظ ہی نہیں رہتے جبکہ پہلے ہی معیار سے کسی مدعیٔ نبوت کا دعویٰ بخیریت نہ گذر سکے۔ جب قرآن اور احادیثِ صحیحہ ہی سے یہ ثابت ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی نیا نبی نہیں آسکتا تو یہ دیکھنے کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے کہ حضور کے بعد دعوائے نبوت کرنے والا کیا لایا ہے اور کیسا انسان ہے۔ اگرچہ مرزا صاحب میرے نزدیک دوسرے اور تیسرے معیار کے لحاظ سے بھی مقامِ نبوت سے اس قدر فروتر ہیں کہ بابِ نبوت کھلا بھی ہوتا تو کم از کم کوئی معقول آدمی تو ان پر نبوت کا گمان نہیں کرسکتا تھا، لیکن میں اس بحث کو قرآن و حدیث کے ناطق فیصلے کے بعد غیر ضروری بھی سمجھتا ہوں اور خدا و رسول کے مقابلے میں گستاخی بھی۔

یہ سوال کہ قرآن و حدیث سے بابِ نبوت کے قطعی طور پر بند ہونے کے دلائل کیا ہیں، اس کا متحمل نہیں ہے کہ ایک خط میں اس کا جواب دیا جائے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے فرصت دی تو انشاء اللہ اس موضوع پر ایک مفصل مضمون لکھوں گا، ورنہ سورۂ احزاب کی تفسیر میں تو یہ بحث آنی ہی ہے۔

چند کاروباری مسائل

سوال:- ایک درآمد کنندہ (Importer) غیر ممالک سے مال منگوانے کے لئے ۱۰ فیصدی پر بنک میں لیٹر آف کریڈٹ کھولتا ہے، اور بعد میں اپنے اس بک کرائے ہوئے

مال کو انہی شرائط کے مطابق جن شرائط پر اس نے خود مال بک کیا ہے، فروخت کر دیتا ہے۔
یعنی دس فیصدی بیعانہ کے ساتھ!

مذکورۂ بالا شرائط میں سے ایک اہم اور واضح شرط یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر مال مذکور تحریر کردہ مدت کے اندر شپ (Ship) نہ ہو سکا، یا کسی ہنگامی حالت کی وجہ سے سرے سے سودا ہی منسوخ ہو گیا تو خریدار کو بیعانہ واپس دے کر معاملہ ختم کرنا ہوگا۔ (عملاً اسی طرح ہوتا ہے)
گویا مال شپ نہ ہونے کی صورت میں خریدار اس مال کے نفع نقصان کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اگر مال بک ہو گیا تو مال کا بھگتان ہوتا ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں بیعانہ واپس اور سودا منسوخ۔ چاہے یہ سودا کئی جگہ پہ فروخت ہو چکا ہو۔

اس طریق کار میں وہ کونسے نقائص اور خرابیاں ہیں جن کی بنا پر اسے شرعاً نادرست کہا جاتا ہے۔ اس قسم کا لاکھوں روپیہ کا کاروبار تقریباً ہر مہینے ہم کرتے ہیں اور اس الجھن میں پڑ گئے ہیں کہ یہ طریقہ درست بھی ہے یا نہیں۔ ایک صاحب علم کی رائے اس کے حق میں بھی ہے۔

جواب: جس صورت معاملہ کو آپ دریافت کر رہے ہیں اس کی دو الگ الگ شکلیں ہیں اور دونوں کا حکم الگ ہے۔

ایک شکل یہ ہے کہ آپ نے ایک مال بنک کی معرفت بک کرایا اور بعد میں آپ کی اور ایک دوسرے تاجر کی باہمی قرارداد سے وہ بکنگ اس کے نام منتقل ہو گیا۔ یہ شکل اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ یہ بکنگ خواہ منافع کے ساتھ بیچی جائے یا محض ایک شخص سے دوسرے شخص کے نام منتقل ہو، بہر حال وہ ایک شخص کی طرف سے دوسرے شخص کی طرف پوری طرح منتقل ہو جائے۔ یعنی بنک میں لیٹر آف کریڈٹ شخص اول کے بجائے شخص ثانی کے نام پر کھل جائے اور شخص اول کا اس مال کے سودے سے کوئی تعلق باقی نہ رہے، اس کی ہر چیز کا ضامن شخص ثانی ہی ہو، شخص اول کی کوئی ذمہ داری اس معاملہ کے ساتھ لگی نہ رہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ اس مال کو بک کرانے کے بعد قبل اس کے کہ وہ یہاں پہنچے اور آپ کے

قبضہ میں آئے، آپ اسے اپنے مال کی حیثیت سے منافع پر دوسرے شخص کے ہاتھ بیچیں اور بیعانہ لے لیں۔ پھر دوسرا تیسرے کے ہاتھ، تیسرا چوتھے کے ہاتھ اُسی غائب مال کو اپنا اپنا منافع لگا کر بیچتا اور بیعانہ لیتا چلا جاتا ہے۔ اس شکل میں خواہ شپ منٹ نہ ہو سکنے یا سودا منسوخ ہو جانے پر ہر ایک شخص بیعانہ واپس کر دینے کا کفیل ہی کیوں نہ ہو اور خواہ ہر ایک نے یہ وعدہ ہی کیوں نہ کر لیا ہو کہ سودے کی منسوخی کی صورت میں کوئی بھی نفع و نقصان کا مطالبہ نہ کرے گا، بہر حال یہ خرید و فروخت شرعاً ممنوع ہے۔ اس کے ممنوع ہونے کی نقلی دلیل یہ ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا ہے:

"لا تبع ما ليس عندك"[1] (احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ) "اذا اشتريت شيئاً فلا تبعه حتى تقبضه"[2] (احمد) "نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يشترى الطعام ثم يباع حتى يستوفى"[3] (احمد، مسلم) "كانوا يتبايعون الطعام جزافاً باعلى السوق فنهاهم رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يبيعوه حتى ينقلوه"[4] (بخاری، مسلم، ابوداؤد)

ان احادیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز کو خرید کر قبضے میں لئے بغیر بیچنا ممنوع ہے اس کے ممنوع ہونے کی عقلی دلیل یہ ہے کہ اول تو اس طرح کی خرید و فروخت میں جھگڑے کے امکانات ہیں۔ دوسرے اس میں بغیر کسی حقیقی تمدنی خدمت کے ایک شخص سے دوسرا شخص ایک غائب چیز کو اپنا منافع لگا لگا کر بیچتا اور خریدتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ صارفین (Consumers) تک پہنچتے پہنچتے اس چیز کی قیمت چڑھ کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ یہ بہت سے بچولیوں کی منافع

[1] کوئی ایسی چیز نہ بیچو جو فی الواقع تمہارے پاس موجود نہ ہو۔

[2] جب تم کوئی چیز خریدو تو اسے اپنے قبضہ میں لینے سے پہلے آگے فروخت نہ کرو۔

[3] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ ایک شخص غلہ خریدے اور پورا پورا ماپ تول کر لینے سے پہلے اسے آگے کو فروخت کر دے۔

[4] لوگ غلے کے ڈھیر منڈی میں کھڑے کھڑے خریدتے اور وہیں بیچ دیتے تھے۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ جب تک غلہ اس جگہ سے منتقل نہ کر دیا جائے آگے نہ بیچا جائے۔

خوری، بغیر اس کے کہ وہ واقعی کوئی خدمت اس مال کے پیدا کرنے یا فراہم کرنے میں انجام دیں خواہ مخواہ اشیاء کی قیمتیں چڑھنے کی موجب بنتی ہے۔

سوال: حسب ذیل سوالات کے جواب مطلوب ہیں:

(۱) میری دکان بساطخانہ (General Merchant) کی ہے۔ جنرل مرچنٹ کے ہاں ہر قسم کے سودے فروخت ہوتے ہیں، خاص کر پوڈر، کریم، لپ سٹک، نیل پالش اسینٹ، عطر، ریشمی بنیان، ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ، فینسی نگ سٹ، سنگار دان، بچوں کے کھلونے، زیورات وغیرہ۔ کیا مندرجہ بالا چیزیں ناجائز ہیں، یا ان کو فروخت کرنا ازروئے شریعت ممنوع ہے؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تمام چیزیں تعیش میں مدد دیتی ہیں لہٰذا یہ مسرفانہ فعل ہے۔ اس کو فروخت کرنے اور استعمال کرنے سے احتراز کرنا چاہئے۔ کیا یہ درست ہے؟

(۲) کیا شریعت نے نفع کی مقدار مقرر کی ہے؟ اگر ہے تو کیا؟ اور اگر نہیں ہے تو کہاں تک نفع لیا جاسکتا ہے؟ کیا دکاندار کو اس چیز کا اختیار ہے کہ وہ اپنی چیز مارکیٹ کے لحاظ سے یا کسی اور دام پر فروخت کرسکے؟ (واضح رہے کہ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن میں بہت کم نفع ہوتا ہے۔ یا خرید کی قیمت یا کچھ کم پر فروخت کرنی پڑتی ہیں)

(۳) موجودہ دور میں ہر کاروبار کو عورت کے اشتہار کے ساتھ شروع کیا جاتا ہے۔ الحمدللہ کہ میں اس لعنت سے بچا ہوا ہوں لیکن جو چیزیں ولایت سے آتی ہیں یا ملک و قوم کے لوگ تیار کرتے ہیں ان پر عورت کی تصویر مختلف ہیئتوں (Poses) میں نمایاں رہتی ہے لیبل کو پھاڑ دینے سے چیز کو فروخت کرنا مشکل بلکہ غیر ممکن ہے۔ ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ بعض دوست شکایت کرتے ہیں کہ تم تصویروں کی خرید و فروخت کرتے ہو اور یہ حرام ہے۔

(۴) کیا شریعت نے سودے کو ایک دام پر فروخت کرنے کی قید لگائی ہے؟ اگر نہیں تو مول بھاؤ چکانا درست ہے؟

(۵) دکان پر بے پردہ عورتیں آتی ہیں اور نیم نقاب پوش بھی۔ اسلام کا حکم ہے کہ اگر

عورت پر دوسری نظر پڑے تو انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہاں ان سے گفتگو تک کرنی پڑتی ہے۔ عورتوں کو دکان پر نہ آنے دیا جائے تو یہ بھی ٹھیک نہیں، کیونکہ اس ماحول میں تو اکثریت ایسی عورتوں کی ہے جو مردوں کے بدلے شاپنگ کرتی ہیں۔

(۷) بالعموم ہر دکاندار دو قسم کے کھاتے رکھتا ہے۔ ایک تو اس کا نجی کھاتا ہوتا ہے، دوسرا سیل ٹیکس اور انکم ٹیکس کے افسران کو دکھانے کے لئے۔ کیا یہ طریقہ درست ہے؟ اگر نہیں تو تاجر کیا کرے؟ ایک صاحب جن کا تعلق میرے بازار سے نہیں لیکن میں انہیں جانتا ہوں، انہوں نے ایک سال کا پورا حساب انکم ٹیکس کے افسر کے سامنے پیش کیا، ایک پیسہ کی بھی انہوں نے چوری نہ کی تھی۔ لیکن افسر نے ٹیکس کے علاوہ خرید بھاری رقم ان پر لاد دی۔ اور شبہ یہ ظاہر کیا کہ جو حساب اسے دکھایا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیئے؟

جواب:۔ آپ کے سوالات کے جوابات علی الترتیب درج ذیل ہیں:۔

(۱) بساط خانہ میں جو چیزیں آپ فروخت کرتے ہیں (جن کی کچھ فہرست بھی آپ نے دی ہے)، ان میں سے کوئی چیز بھی فی نفسہٖ حرام نہیں ہے۔ ان کا استعمال جائز بھی ہو سکتا ہے اور ناجائز بھی۔ دکاندار کی حیثیت سے آپ پر یہ دیکھنا فرض نہیں ہے کہ کون ان چیزوں کو کس طرح استعمال کریگا۔ آپ کے لئے صرف یہ بات کافی ہے کہ آپ کوئی حرام چیز فروخت نہ کریں، نہ بیع و شریٰ میں حرام طریقے استعمال کریں۔

(۲) شریعت نے نفع کے لئے کوئی مقدار مقرر نہیں کی ہے۔ یہ تو عُرف اور انصاف کے معروف تصور پر مبنی ہے کہ کس تجارت میں کتنا منافع واجبی ہے اور کتنا ناواجب۔

(۳) جو چیزیں دکاندار کی حیثیت سے آپ باہر سے منگواتے ہیں یا ملک کے صناعوں سے خریدتے ہیں ان پر اگر عورتوں کی تصاویر ہوں تو یہ چیز اس بات کے لئے کافی نہیں ہے کہ آپ پر ان چیزوں کی خرید و فروخت حرام ہو جائے۔ آپ قصداً یہ تصویریں اُن اشیاء پر خود نہیں

لگاتے ہیں اور نہ آپ کی فرمائش پر یہ کارخانوں میں لگائی جاتی ہیں۔ یہ تو ایک بلائے عام ہے جس میں ہم سب مجبوراً مبتلا ہو رہے ہیں۔ معترضین کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ اس طرح آپ تصویروں کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ دراصل آپ تصویریں خریدتے اور بیچتے نہیں ہیں بلکہ وہ چیزیں خریدتے اور بیچتے ہیں جن پر کارخانہ داروں نے دنیا کی بگڑی ہوئی ریت کی بنا پر تصویریں چپکا رکھی ہیں۔

(۴) سودے کو ایک ہی دام پر بیچنا کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ خریدار سے بات چیت کر کے آپ کم و بیش پر بھی فروخت کر سکتے ہیں۔ مگر جھوٹ بولنا اور جھوٹی قسمیں کھانا جائز نہیں۔ خریدار کو یہ یقین دلانے کی کوشش نہ کیجئے کہ یہ مال اتنے کو خریدا ہے، درآنحالیکہ وہ اس سے کم میں آپ کو پڑا ہو، یا یہ کہ اس میں آپ کو کوئی نفع نہیں بچتا، درآنحالیکہ اس میں نفع بچتا ہو۔

(۵) عورتیں اگر بے پردہ آپ کی دکان پر آئیں تو انہیں آنے سے روکنا یا ان کے ہاتھ مال بیچنے سے انکار کرنا آپ پر فرض نہیں ہے۔ البتہ آپ کا فرض یہ ہے کہ غضِ بصر سے کام لیں۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہ کریں۔ ان کے حسن و آرائش سے یا ان کی گفتگو سے لذت لینے کی کوشش نہ کریں۔ تقویٰ کی اسی ایک ذراسی تنسق پر آپ عامل ہو جائیں تو انشاء اللہ اپنی دوکان پر بیٹھے بیٹھے آپ کو درجۂ ولایت حاصل ہو جائے گا۔ تنہا یہی مجاہدہ بہت سے خانقاہی مجاہدوں پر بھاری ہے۔

(۶) اس بگڑے ہوئے ماحول میں جو شخص چور اور جعل ساز نہیں ہے وہ بھی چور اور جعل ساز ہی فرض کیا جاتا ہے۔ کیونکہ دنیا اب یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ کوئی شخص کاروبار میں سچا اور ایماندار بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے بگاڑ کی حالت میں جو لوگ سچائی اور ایمانداری کی راہ چلنے کا عزم کریں انہیں اس کی سزا بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ جھوٹے اور بددیانت لوگ تو رشوت دے کر اپنے جرائم کی پاداش سے بچ نکلتے ہیں مگر سچے اور ایماندار آدمی کے لئے یہاں دوہری سزا ہے، ایک سزا سچائی اور ایمانداری سے کام کرنے کی اور دوسری رشوت نہ دینے کی۔ یہ سزائیں بھگتنے کی ہمت نہ ہو تو جس بگاڑ میں دنیا مبتلا ہے آپ بھی اسی میں مبتلا ہو جائیے۔ دنیا اور آخرت میں سے ایک کو انتخاب کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔

سوال: کسی مشترک کاروبار مثلاً کسی کمپنی کے حصص کی زکوٰۃ کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آسکا۔ حصّہ بجائے خود تو کوئی قیمتی چیز نہیں ہے، محض ایک کاغذ[1] کا ٹکڑا ہے۔ صرف اس دستاویز کے ذریعے حصہ دار کمپنی کی املاک (یا جائداد مشترکہ) میں شامل ہوکر بقدر اپنے حصّہ کے مالک یا حصّہ دار قرار پاتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ کمپنی کے املاک کیا اور کس نوعیت کے ہیں۔ اگر کمپنی کی جائداد تعمیرات (بلڈنگ)، اراضیات اور مشینری پر مشتمل ہو تو حصہ دار کی شراکت بھی ایسے ہی املاک کی ہوگی جس پر آپ کے بیان کردہ اصول کے ماتحت زکوٰۃ نہیں آتی۔ حصّہ دار کے حصہ کی مالیت تو ضرور ہے لیکن وہ اس تمام مالیت کا جزو ہے جو غیر منقولہ جائداد کی شکل میں کمپنی کو مجموعی حیثیت سے حاصل ہے۔ پھر حصہ دار کے حصے پر زکوٰۃ کیوں عائد ہونی چاہئے؟

جواب: کمپنی کے جس حصہ دار کے حصہ کی مالیت بقدرِ نصاب ہے اس کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ وہ قدرِ نصاب کا مالک ہے۔ اب اگر اس نے اپنے اس روپے کو کمپنی کے کاروبار میں لگا رکھا ہے تو اُس سے اُس کے حصے کی مالیت کے لحاظ سے انفرادی طور پر زکوٰۃ نہیں لی جائے گی بلکہ کمپنی سے تجارتی زکوٰۃ کے قواعد کے مطابق تمام ایسے حصہ داروں کی زکوٰۃ اکٹھی لے لی جائے گی

---

[1] "حصّہ" کے متعلق سائل نے بہت ہی غلط تصور پیش کیا ہے۔ کاغذ کا ٹکڑا نہ حصہ ہوتا ہے نہ اصل حیثیت رکھتا ہے، بلکہ وہ ایک دستاویز ہوتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ فلاں شخص فلاں کاروبار میں اس تناسب سے حصہ دار ہے۔ غور کیجئے کہ اگر دو آدمی ایک دکان میں برابر کے شریک ہوں اور وہ اپنی شراکت کے لئے دستاویز لکھ کر رکھ لیں تو دستاویز ان کا اصل حصۂ شرکت نہیں ہوگی بلکہ حصص کا ریکارڈ ہوگی۔ یہی صورت زیادہ حصّہ داروں کے مشترک کاروبار کی ہے۔ اسی بنا پر یہ بھی غلط کہا گیا ہے کہ "حصہ بجائے خود تو کوئی قیمتی چیز نہیں ہے"، حالانکہ دراصل حصہ ہی بجائے خود قیمتی چیز ہے۔ کیونکہ "حصہ" نام ہے کسی تناسب سے ایک کاروبار اور اس کے سرمائے اور متعلقہ املاک کے حقوقِ مالکانہ میں شریک ہونے کا، اور حصہ کی قیمت دراصل انہی حقوقِ مالکانہ کی قیمت ہوتی ہے۔ حصہ کوئی خیالی وجود نہیں بلکہ ایک ٹھوس مادی حقیقت ہے۔

(نائب مدیر)

جن کو زکوٰۃ ادا کرنے کے قابل قرار دیا گیا ہو کمپنی کی زکوٰۃ کا حساب لگانے میں مشینری، مکان، فرنیچر وغیرہ عوامل پیدائش کو مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔ اس کے باقی ماندہ املاک جو اموال تجارت پر مشتمل ہوں اور اسکے خزانہ کی رقم جو ختم سال پر موجود ہو ان سب پر زکوٰۃ لے لی جائے گی۔ اور اگر کمپنی کا کاروبار اس نوعیت کا نہ ہو تو اس کی سالانہ آمدنی کے لحاظ سے اس کی مالی حیثیت مشخص کی جائے گی اور اس پر زکوٰۃ لگا دی جائیگی۔

رکنیتِ جماعتِ اسلامی کی ایک درخواست پر فیصلہ

سوال:۔ ایک مقامی جماعتِ اسلامی کے امیر رپورٹ کرتے ہیں:۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صاحب عرصہ سے سرگرمی سے کام کر رہے ہیں، رکنیت کے اہل ہیں؛ عرصہ سے ان کی درخواست پڑی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کی ذاتی زندگی شریعت کے مطابق ہے۔ مگر دکان کے حسابات اصلی پیش نہیں کرتے ہیں۔ ۔ ۔ کیونکہ انکم ٹیکس والے نفع کی فیصدی اتنی زیادہ لگاتے ہیں کہ اگر اصل بکری دی جائے تو ساری آمدنی ٹیکس میں چلی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی چیز قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔"

اس پر حلقہ کی جماعتِ اسلامی کے امیر رپورٹ کرتے ہیں:۔

" درخواست کنندہ نہایت صالح نوجوان ہے اور جماعت کے کاموں میں کافی ایثار اور سرگرمی کا مظاہرہ کرتا رہا ہے۔ اس کے بارے میں صرف انہی جعلی حسابات کا معاملہ ہمارے لئے پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ، اگر صحیح حسابات پیش کئے جائیں تو سیلز ٹیکس اور انکم ٹیکس کی نذر نہ صرف منافع کی کمائی بلکہ پونجی کا ایک حصہ بھی ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں وہ نہایت مجبوری کی حالت میں غلط حسابات پیش کرتا ہے۔ لیکن دوسری طرف ہمارے لئے بھی یہ مشکل ہے کہ ایک ایسے شخص کو جو جان بوجھ کر غلط بات کو صحیح بنا کر پیش

کرتا ہے۔ کنیت کے لئے کیسے قبول کریں۔ چونکہ یہ ایک منفرد کیس نہیں ہے ۔۔۔ اسلئے اپنی اور حلقہ کی مجلس شوریٰ کی رہنمائی کے لئے یہ درخواست آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں کہ آپ ہمیں اس کے متعلق مشورہ دیں کہ ایسے حالات میں ہم کیا رویہ اختیار کریں"؟

جواب :- ہم نے یہ جماعت اس لئے نہیں بنائی ہے کہ ایک ایک آدمی ایک ایک مجبوری کی بنا پر دین و اخلاق کے ایک ایک اصول کو توڑتا چلا جائے۔ اگر ہمیں ایسا کرنا ہوتا تو پھر اس جماعت کے بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ہمارے پیش نظر تو ایسے لوگوں کو منظم کرنا ہے جو بہر حال صداقت اور دیانت پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں اور جھوٹ اور بد دیانتی کی طاقتوں سے دبنے کے بجائے اُن سے لڑیں۔ اگر ہم اس طرح جماعت کے نظم میں ڈھیل دیتے چلے جائیں کہ جن جن بد دیانتیوں کے لئے لوگ مجبور ہوں ان کی اجازت دے دیا کریں تو اس جماعت میں بھی ضعیف الاخلاق لوگ جمع ہو جائیں گے اور ان سے کوئی اصلاح کا کام نہ ہو سکے گا۔ یہ ہم کو معلوم ہے کہ سیلز ٹیکس اور انکم ٹیکس نے کس طرح تمام تجارت پیشہ لوگوں کو جھوٹا اور جعل ساز بنا دیا ہے۔ یہ بھی ہم کو معلوم ہے کہ سرکاری ملازموں کو رشوت دے کر بڑی آسانی سے وہ تمام تکلیفیں رفع کی جا سکتی ہیں جو اس سلسلے میں پیش آسکتی ہیں۔ یہ بھی ہم کو معلوم ہے کہ اگر کوئی شخص رشوت بھی نہ دے اور جعلی حسابات بھی نہ رکھے تو اس کے لئے کاروبار چھوڑ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود نہ ہم اپنے ارکان کو رشوت دینے کی اجازت دے سکتے ہیں اور نہ جعلی حسابات رکھنے کی۔ اس کے بجائے ان کا کام یہ ہے کہ وہ تجارت پیشہ لوگوں میں اخلاقی حس پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ ان کو منظم کریں اور ان کی باقاعدہ انجمنیں قائم کر کے —— اور اگر وہ پہلے سے قائم ہوں تو ان کی رائے کو ہموار کر کے —— یہ متفقہ فیصلہ کرائیں کہ کوئی شخص کسی سرکاری افسر کو ایک پیسہ رشوت نہ دے، کوئی شخص جھوٹے حسابات نہ رکھے، اگر سرکاری ملازمین انتقاماً ان کے اصلی حسابات کو غلط قرار دے کر ان کی فروخت یا آمدنی فرضی طور پر زائد تشخیص کریں اور ان پر زیادہ ٹیکس عاید کریں تو کوئی شخص اس ٹیکس کا ایک پیسہ ادا نہ کرے، اگر ایسے بے جا ٹیکس کی وصولی کے لئے

کسی کی دکان کا مال نیلام کیا جائے تو اس پر کوئی شخص بولی نہ دے جب تک اس طرح کی تنظیمیں نہ ہونگی ہمارے ارکان کو نقصان اٹھا کر کام کرنا پڑے گا کیونکہ ننانوے بے ایمانوں کے درمیان ایک ایماندار کبھی چین سے زندگی بسر نہیں کرسکتا لیکن اگر سب کو ـــ یا کم از کم اکثریت ہی کو ـــ دیانت اور راستبازی پر متفق کرلیا جائے تو سب کے لئے حلال روزی حاصل کرنا بھی ممکن ہو جائے گا اور سرکاری ملازمین کی زیادتیوں کا بھی سدباب ہوسکے گا۔

طالبانِ قانونِ شریعت

سوال :- میاں ممتاز دولتانہ اور دیگر وزراء کی حالیہ تقاریر سے متاثر ہو کر مالکان زمین اس بات پر آمادہ ہو رہے ہیں کہ وہ اپنے حقوق کو محفوظ کرانے کے لئے شریعت کے قانون کے نفاذ کا مطالبہ کریں اور دوسری کسی ایسی ویسی سکیم کو تسلیم نہ کریں جو ان کے حقوق کو سلب کرنے والی ہو۔ چنانچہ کیمبل پور میں ایسے ہی لوگوں نے مل کر "طالبانِ قانونِ شریعت" کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی ہے جو کیمبلپور کے ضلع میں اس مطالبہ کو اٹھائے گی اور دوسرے اضلاع میں بھی اس کو حرکت میں لانے کی کوشش کرے گی۔ . . . اس انجمن نے اس غرض کے تحت ایک ہینڈبل بعنوان "انجمن طالبانِ قانونِ شریعت کا مطالبہ" اور ایک مراسلہ بنام ممبران پنجاب اسمبلی طبع کرایا ہے . . . موجودہ حالات میں ہمیں توقع ہے کہ یہ لوگ ہمارے نصب العین یعنی نفاذِ قانونِ شریعت سے دلچسپی لیں۔ اس بارے میں آپ ہمیں ہدایت فرمائیں کہ آیا ہم ان کے ساتھ مل کر کام کرسکتے ہیں؟

جواب :- ایسے "طالبانِ قانونِ شریعت" کے ساتھ کسی تعاون اور اشتراکِ عمل کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ہے جو پوری شریعت کو ہڑپ کر جانے کے بعد کسی ایک مسئلہ میں شرعی قانون کے طالب بن کر اس لئے کھڑے ہو رہے ہوں کہ اس مسئلے میں شریعت کا قانون اُن کی

خواہش نفس کے مطابق ہے۔ ایسے لوگوں کو آپ صاف بتا دیجئے کہ ہمارا ان کے ساتھ کوئی میل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ شریعت الٰہی کا نفاذ اور قیام نہیں چاہتے بلکہ اُسے اپنے مفاد کے تحفظ کا آلہ کار بنانا چاہتے ہیں۔ اگر وہ فی الواقع شریعت کے حامی اور طالب ہیں تو پوری شریعت کے قیام اور نفاذ کو اپنے پروگرام میں شامل کریں اور اپنی زندگیوں اور معاملات سے اس کی عملی شہادت دیں اگر وہ ایسا کر دیں تو ان کے ساتھ تعاون اور اشتراک عمل کے مسئلے پر غور کیا جا سکتا ہے ورنہ نہیں۔

ریڈیو کے ذریعہ سے رویتِ ہلال کی خبر

سوال۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین مندرجہ ذیل مسئلہ میں کہ رویت ہلال کے لئے ریڈیو کا اعلان شرعاً نافذ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ صرف ریڈیو کے اعلان سے عید الفطر اور عید الضحیٰ کے احکام و نماز و ذبائح کر سکتے ہیں یا نہیں۔ قرآن اور حدیث سے اور استنباطِ ائمہ مجتہدین سے مدلل جواب تحریر فرماویں۔ بیّنوا توجروا۔

جواب۔ میری رائے میں اس مسئلے کے متعلق فرداً فرداً علماء سے سوال کرنے کے بجائے حکومتِ پاکستان سے مطالبہ کرنا چاہئے کہ وہ ملک کے مستند علماء کی ایک مجلس اس مسئلے کا تصفیہ کرنے کے لئے مقرر کرے اور وہ مجلس جو فیصلہ بھی کرے اسی پر ملک میں عمل کیا جائے۔ ہماری اپنی حکومت قائم ہو جانے کا کیا فائدہ ہے اگر ہمارے ہاں اس طرح کے مسائل کا تصفیہ کرنے کا بھی کوئی اجتماعی انتظام نہ ہو سکے اور ہر عید و بقر عید پر اختلاف کا ایک ہنگامہ برپا ہوتا رہے۔ علماء کی انفرادی آراء بہر حال اس باب میں مختلف رہیں گی اور ان سے فتوے لینے کا کوئی خاص فائدہ نہ ہو گا۔

(ا۔ م)

مطبوعات

The Kingdom of God

مؤلفہ: جناب سید علی احمد شاہ صاحب پریذیڈنٹ آزاد کشمیر گورنمنٹ۔
شائع کردہ: شیخ محمد اشرف، کشمیری بازار، لاہور
قیمت درج نہیں۔

انتیس صفحے کا یہ انگریزی پمفلٹ اسلامی دستوریات سے بحث کرتا ہے۔ جناب مؤلف نے دستورِ پاکستان کی بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ میں جن ترامیم کی ضرورت محسوس کی ہے ان کو مختصراً سلسلہ وار پیش فرمایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پمفلٹ دینی جس کا مظہر ہے اور متعدد ترامیم ایسی ہیں کہ جن سے اسلام پسند طبقہ مطمئن ہوگا۔ پھر پمفلٹ اس بات کی بھی شہادت دیتا ہے کہ شاہ صاحب نے قرآن اور بائیبل کی خاصی ورق گردانیاں کی ہیں۔

لیکن دوسرے پہلو سے ایک تبصرہ نگار کی نگاہ بعض ایسے پہلو بھی دیکھتی ہے کہ جن کی طرف بڑے ادب و احترام سے اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ اول تو تحریر کا مزاج اور بحث کا اسلوب دستوریاتی نہیں اور پھر استدلال میں مذہبی عقیدت کا زور جتنا شامل ہے اتنا فکری انداز نہیں بلکہ اس پہ مزید یہ کمزوری کہ بعض مواقع پر کسی موضوع کے لئے جن آیاتِ قرآنی کا حوالہ دیا گیا ہے ان کا کوئی بنیادی تعلق اس موضوع سے نہیں۔ اور جن آیات قرآنی میں اس موضوع کے لئے مواد ہے وہ بالکل درکنار رہ گئی ہیں۔ اس طرح آیات کو اصل محل سے ہٹا کر استعمال کرنے کی جو شایان پیدا ہو گئی ہیں ان میں سے بطور نمونہ ایک کا تذکرہ یہاں کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ "مرکزی مقننہ کو مؤلف "ہاؤس آف پیرنٹس" (House of Parents) کا نام دیتے ہیں اور اس نام کو قرآنی روح کے مطابق قرار دیتے ہوئے ان آیات کو حوالہ میں پیش کرتے ہیں جن میں اطاعت و خدمت والدین کا حکم دیا گیا ہے۔

آپ کی رائے میں پاکستان کی ریاست "اسلامی" ہونے کے باوجود کثیر الاحزاب ریاست

(Multi Pa ties State) قرار پاتی ہے، کیونکہ آپ ص۱۰۱ پر صدرِ حکومت کے حلف کی دفعہ ۳۱ پر گفتگو کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ وہ اکثریت رکھنے والی پارٹی (یعنی مسلمانوں میں) سے ہوگا۔ اس عبارت سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اسلامی ریاست کی کارفرمائی مسلم اکثریت اور غیر مسلم اقلیتوں کے درمیان مشترک ہے۔ اسے سہو سمجھا جا سکتا تھا لیکن دوسری جگہ آپ نے وزارت میں غیر مسلموں کو شریک کر کے واضح کر دیا ہے کہ درحقیقت آپ کا تصوّر یہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مرکزی مقنّنہ کے لئے مردوں اور عورتوں کے مشترک ایوانِ اعلیٰ (کیونکہ دونوں صنفوں کے بغیر "ایوانِ والدین" کیسے بنتا) کی ضرورت کو نمایاں کیا ہے۔

پھر "وزیر اعظم" کے لئے خلیفہ کی اصطلاح تجویز کرنا۔ اور اس پر منجملہ دیگر آیات کے "إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً" کو دلائل کی صف میں لا رکھنا بھی بہت عجیب معلوم ہوا۔

دفعہ ۷۴ ص۲۶ کے تحت بلوں کی توثیق پر گفتگو کرتے ہوئے آپ یہ تجویز فرماتے ہیں کہ بل تو ایوان پاس کرے لیکن جب وہ صدرِ ریاست کے سامنے منظوری کے لئے جائے تو وہ ماہرینِ علومِ دین کے مشورے سے اس کی منظوری کا فیصلہ کرے۔ یوں تو ماہرینِ علومِ دین کا مشورہ صدرِ ریاست کے لئے قدم قدم پر لازم ہوگا لیکن اگر اس مقصد کے لئے دستور کے تحت کوئی خاص مجلس تشکیل پائے تو پھر ثنویت کا یہ سسٹم حد درجہ خطرناک ہے۔ جب بھی دنیا کے ماہرین اور دین کے ماہرین کو آپ الگ کریں گے تو دونوں میں تصادم ہو کے رہے گا۔ دنیا کے ماہرین بل پاس کریں اور دین کے ماہرین اس بل کی قسمت کا فیصلہ کریں تو یہ صورت بہر حال چلنے والی نہیں۔ آپ کے معمولی ایوان ہی کو دین و دنیا کے ماہرین کا جامع ہونا چاہئے۔ بغیر اس کے مقنّنہ کی کل کبھی سیدھی نہ بیٹھے گی۔

یہ چند باتیں نہ بطور سوئے ادب عرض کی گئی ہیں، نہ بطور تنقیص بلکہ محض تبصرہ کے ناخوشگوار تقاضے کے تحت پورے جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ عرض کی گئی ہیں۔ ان ساری چیزوں کے باوجود ہم جنابِ مولف کے جذبہ کی قدر کرتے ہیں۔

(بقیہ اشارات) نہیں آسکتی۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہم نے عوام کو اسلامی ریاست کے صحیح تصور سے آشنا کرنے اور مطالبۂ نظامِ اسلامی پر متفق کرنے کی جو کوشش کی تھی، اور اس کے ساتھ ہمدردوں اور متفقین کے حلقے بنانے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس کے اندر اس تجویزِ علاج کے مذکورۂ بالا تینوں اجزاء کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی تھی۔ پھر قرارداد مقاصد پاس ہونے کے بعد اس کے تضمنات (Implications) اور اس کے تقاضوں کو کھول کھول کر عوام کے ذہن نشین کرنا، اس کی ایک ایک خلاف ورزی کو جو عنصرِ اوّل کی طرف سے ہوئی، نمایاں کر کے عوام کو اس کی طرف توجہ دلانا، اس کی تعمیل پر اربابِ اقتدار کو مجبور کرنے کیلئے رائے عام کو تیار کرنا، اور صالح قیادت کی ضرورت و اہمیت عوام کے ذہن نشین کرنا، یہ سب کچھ بھی اسی تجویزِ علاج کے مطابق تھا۔ اس کے بعد انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ اور اس کا مخصوص طریق کار بھی اسی علاج کے پروگرام کا ایک جزء تھا اور ہے۔ صرف ایک پنجاب کی انتخابی جدوجہد ہی میں ہم نے پانچ چھ مہینہ کی مختصر مدت میں کم و بیش ۲۵ لاکھ آدمیوں تک جن میں دیہاتی اور شہری، دونوں قسم کے عوام شامل تھے، اسلام کی دعوت پہنچائی، ان میں سے تقریباً سوا دو لاکھ آدمیوں کو ہر خوف اور لالچ اور فریب کے علی الرغم اس دعوت کے حق میں ووٹ دینے پر آمادہ کر لیا، اور ان میں سے عنصرِ دوم کے تقریباً دو ہزار نئے آدمیوں کو اصلاح کی عملی سعی میں ہاتھ بٹانے کے لئے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اسی طریقہ سے اب سرحد و سندھ کے انتخابات کو بھی انشاء اللہ ہم اس مقصد کے لئے استعمال کریں گے۔

یہ ہماری ابتدائی کوششیں تھیں۔ اب اس علاج کے لئے جو جامع پروگرام ہم نے بنایا ہے وہ ہماری مجلس شوریٰ کے تازہ اجلاس کی کارروائی میں سامنے آچکا ہے۔ اس پروگرام کی خصوصیات یہ ہیں:۔

(۱) حلقہ ہائے متفقین کی تنظیم اس غرض کے لئے ہے کہ اصلاح کے کام میں عنصرِ دوم کا تعاون زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر، اور زیادہ سے زیادہ باقاعدگی کے ساتھ حاصل کیا جائے۔

(۲) تربیت گاہوں کا قیام اس غرض کیلئے ہے کہ ارکانِ جماعت کے ساتھ ساتھ متفقین کو بھی ذہنی اور اخلاقی حیثیت سے اس کارِ عظیم کیلئے تیار کیا جائے۔

(۳) حلقہ ہائے متفقین کے سامنے سردست کام کا جو ابتدائی پروگرام رکھا گیا ہے وہ اس غرض کیلئے ہے کہ متفق اصحاب اور خواتین بتدریج عوام سے ربط پیدا کرنے کیلئے آگے بڑھیں اور ان کی مذہبی، اخلاقی، تعلیمی، تمدنی اور معاشی حالت درست کرنے کیلئے سعی کی ابتدا کر دیں۔ آگے چل کر رفتہ رفتہ اس دائرۂ عمل کو زیادہ وسیع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) مزدوروں اور پیشہ ور گروہوں کی تنظیم اس غرض کیلئے ہے کہ ان کی معاشی مشکلات کے حل میں مدد دینے کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی اور دینی حالت کو بھی درست کیا جائے، اور انہیں اشتراکی تحریک کا آلۂ کار بننے سے بچایا جائے۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اوّل

اِسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصّہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مُسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصولِ اسلام اور مُسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مُسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے ؛۔

حصّۂ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اُصولوں پر قائم کیجا سکتی ہے، ایسا اِقدام کرنے والے گروہ کو کن اُصولوں پر منظم کیا جاسکتا ہے، اور اِن اصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جاسکتے ہیں، اُن کا جواب کیا ہے؛ یہ تمام باتیں اِس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کردی گئی ہیں؛۔

قیمت حصہ اول ۱-۱۴-۰ حصہ دوم ۲-۸-۰ حصہ سوم ۲-۰-۰

محصول ڈاک علاوہ

ملنے کا پتہ — مکتبہ جماعت اسلامی دارالاسلام جمالپور۔ پٹھانکوٹ (پنجاب)

[illegible]